جون ۱۹۷۴ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

و لقد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین (القرآن)

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۲۱ | جون ۱۹۷۲ء | شمارہ ٦

فہرست مضامین

تذکرہ و تبصرہ	● عرض احوال	ڈاکٹر اسرار احمد	۱
	● امام الهند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح	” ” ”	۵
تدبر قرآن	● تفسیر سورہ کہف (۵)	مولانا امین احسن اصلاحی	۹
مقالات	● مطالعۂ قرآن کی شرط لازم	سید مشکور حسین یاد	۲۲
	● قرآن اور سائنس	ڈاکٹر عبدالبصیر پال	۲٦
افکار و آراء	● سیل خیال	ڈاکٹر عبدالخالق رحیم یارخاں	۳۲
	● دینی تحریکوں کا باہمی اختلاف	شیخ جمیل الرحمان کراچی	۴۱

* مدیر مسؤل *

ڈاکٹر اسرار احمد

ایم۔بی۔بی۔ایس (پنجاب) ۔ایم اے اسلامیات (کراچی)

* یکے از مطبوعات *

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۱۲۔ افغانی روڈ، سمن آباد، لاہور (فون : ٦٨٢٣٥)

چندہ سالانہ ۱۰/- | قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان ـــــ اور ـــــ **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم** و **حکمت** کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

تذکرہ و تبصرہ
اسرار احمدؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ احوال

ہمیں افسوس ہے کہ اس بار پھر 'میثاق' قارئین تک دس بارہ روز کی تاخیر سے پہنچ پائے گا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ صاحب جنہوں نے تھوڑا ہی عرصہ ہوا 'معاونِ مدیر' کی ذمہ داری سنبھالی تھی دفعتہً علیحدہ ہو گئے اور اس طرح 'میثاق' کا پورا بار دوبارہ راقم ہی پر آ پڑا اور دوسری طرف راقم کو گزشتہ ماہ سوا ماہ کے دوران کئی سفر اختیار کرنے پڑ گئے جن کے باعث میثاق کی طرف توجہ نہ دی جا سکی۔

جن صاحب نے ہمیں دفعتہً داغِ مفارقت دیا وہ ایک باصلاحیت، باہمت اور حوصلہ مند نوجوان ہیں لیکن افسوس کہ متلوّن مزاجی اور قدرے غیر معتدل حوصلہ مندی کے باعث ان کی صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں۔ 'انجمن خدام القرآن' سے وابستگی سے قبل بھی وہ بہت سے اداروں سے وابستہ رہے تھے اور یہاں سے علیحدگی کے بعد کے مختصر سے وقفے میں بھی ان کی ایک سے زائد اداروں کے ساتھ وابستگی کی خبریں مل چکی ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی صلاحیتوں کے بہتر معرف کی صورت پیدا فرما دے اور انہیں کسی اچھے اور مفید کام میں اپنے حوصلے پورے کرنے کے مواقع عطا فرمائے۔ گویا بقول اکبر الٰہ آبادی مرحوم ہماری دعا ان کے حق میں یہ ہے کہ ع "اس دل مضطر کو یا اللہ اطمینان دے!"

قارئین 'میثاق' کے علم میں ہے کہ اواخر ۱۹۷۳ء تک 'دعوت رجوع الی القرآن' کے ضمن میں راقم کی بیرونِ لاہور آمد و رفت اور درس و خطاب کا سلسلہ زیادہ تر جانبِ جنوب ہی رہا یعنی ملتان، رحیم یار خاں، صادق آباد، سکھر اور سب سے بڑھ کر کراچی۔ جانبِ شمال صرف چند بار گوجرانوالہ حاضری ہوئی تھی یا صرف ایک ایک بار گجرات، جہلم، اسلام آباد، ٹیکسلا اور تربیلا۔ پنجاب کے مغربی اضلاع میں سے دو دو بار جھنگ اور جوہر آباد

جانے کا موقع ہوا تھا اور ایک ایک یا دو سرگودھا اور پھلروان۔

اس سال کے آغاز میں جب راقم نے یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ کراچی کا سفر تین تین ماہ کے وقفے سے ہوگا تو دراصل پیش نظر یہی تھا کہ اس دعوت قرآنی کا دائرہ وسیع کیا جائے اور خصوصاً شمالی علاقوں کی طرف زیادہ توجہ دی جائے! چنانچہ پچھلے دو مہینوں کے دوران ان علاقوں کے دو چکر لگے جن کی روداد حسب ذیل ہے:-

اواخر اپریل میں برادرم محمد اسلم خاں ترین، پروجیکٹ ڈائرکٹر ہیوی فورج اینڈ فاؤنڈری ٹیکسلا کی دعوت پر ٹیکسلا میں سیرت النبی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے موضوع پر تقریر کے لئے جانا ہوا اور اسی سفر کے دوران درس قرآن مجید کی ایک نشست مرکزی جامع مسجد اسلام آباد میں خطیب مسجد مولانا عبداللہ صاحب کے زیر اہتمام منعقد ہوئی۔ مولانا موصوف ایک حد درجہ وسیع القلب، پرجوش، ذہین اور مخلص نوجوان ہیں۔ خود بھی قرآن مجید سے خصوصی شغف رکھتے ہیں چنانچہ روزانہ بعد نماز مغرب تقریباً نصف گھنٹہ درس قرآن دیتے ہیں جس میں اوسطاً سو ڈیڑھ سو حضرات شریک ہوتے ہیں۔ راقم کے درس کے خصوصی اعلان پر حاضری ڈھائی صد اور تین صد کے مابین تھی۔

دوسرا سفر وسط مئی میں ہوا۔ پہلے سیدھے تربیلا جانا ہوا جہاں ایک تقریر دائیں کنارے پر واقع کالونی کے کمیونٹی سنٹر کے ہال میں ہوئی اور دوسری تقریر بائیں کنارے پر واقع بین کالونی کے وسیع اور کشادہ ہال میں، دونوں دن وقت بعد نماز مغرب تھا اور عشاء کی نماز دونوں دن تقریروں کے خاتمے پر قدرے تاخیر کے ساتھ مسجد میں باجماعت ادا کی گئی۔ بحمداللہ دونوں اجتماعات میں حاضری توقع سے بہت زیادہ رہی۔ دونوں جگہ ہال پوری طرح پر رہے بلکہ بین کالونی میں تو بہت سے حضرات باہر کھڑے ہو کر تقریر سنتے رہے۔ لوگوں کا ذوق وشوق اور گرمی اور حبس کا صبر و استقلال کے ساتھ مقابلہ قابل دید رہا۔

تربیلا کا دایاں کنارہ صوبہ سرحد کے ضلع مردان کا حصہ ہے اور بایاں کنارہ پنجاب کے ضلع کیمبل پور کا، یہ دونوں اضلاع علمائے دین کے بڑے اہم مراکز ہیں اور یہ امر بہت اطمینان بخش اور حوصلہ افزا ہے کہ اس علاقے کے علماء کرام نے اس دعوت رجوع الی القرآن کو سراہا اور اس کی تصویب و تائید فرمائی۔ ایک اجتماع مولانا محمد اسلام صاحب کی زیر صدارت منعقد ہوا جو مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں انہوں نے تقریر کے اختتام پر بہت حوصلہ افزا کلمات ارشاد فرمائے۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ علاقے کے بعض دوسرے قصبات سے بھی علمائے کرام ان اجتماعات میں شرکت کے لئے تشریف لائے اور بحمداللہ انہوں نے بھی تحسین و تصویب فرمائی۔

تربیلا سے واپسی پر پھر اسلام آباد میں اسی مرکزی جامع مسجد میں درس قرآن کی نشست منعقد ہوئی۔

اور اس بار چونکہ اجتماعِ جمعہ میں بھی اعلان ہو گیا تھا لہٰذا حاضری تین صد سے بھی متجاوز تھی۔ حاضری اور اجتماع کا رنگ تو متقاضی تھا کہ بجائے درس کے تقریر کا انداز رکھا جائے۔ لیکن راقم نے حسبِ اعلان آیۂ برّ (سورہ بقرہ : ۱۷۷) کا درس دیا۔ اور اگرچہ راقم تو اپنے اس روز کے درس سے مطمئن نہ تھا تاہم اسے چاہے سامعین کا حسنِ نظر کہہ لیں چاہے حسنِ سماعت، بہرحال انھوں نے پورے ذوق و شوق کے ساتھ طویل درس سنا اور مختلف طریقوں سے اظہارِ پسندیدگی فرمایا۔

اسی اجتماع میں ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد کے درویش منش ڈائرکٹر ڈاکٹر ملاسے پونا صاحب اپنے متعدد رفقائے کار کے ساتھ شریک ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب درس کے بعد بہت محبت اور شفقت سے ملے اور انھوں نے اگلے روز ادارے میں آنے کی حد درجہ محبت بھرے انداز میں دعوت دی۔ راقم کو جو ذہنی بُعد سرکاری اداروں یا رجالِ سرکار سے ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اس محبت بھری دعوت پر اچانک یاد آیا کہ اِس بستی میں وہ مشہورِ زمانہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی ہے جس کے سربراہ کسی زمانے میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب تھے۔ راقم کو اس وقت اپنے اس درجہ غیابِ ذہنی پر خود بھی حیرت ہوئی۔ بہرحال دوسرے روز ادارے میں حاضری دی اور ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقائے کار کی محبت اور شفقت سے بھرپور حصہ وصول کیا۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔

اسی اجتماع میں اپنے ایک میڈیکل کالج کے زمانہ تعلیم کے ساتھی ڈاکٹر سراج الحق بٹ صاحب سے بھی پورے پچیس برس بعد ملنا ہوا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اس وقت مرکزی وزارتِ صحت کے پلاننگ ونگ کے انچارج ہیں۔ ان کا یہ عہدہ اور کام کا موقع بھی بہت مبارک۔ لیکن راقم کو اصل خوشی اس بات سے ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ جو خود بھی ایم بی بی ایس ہیں بہت دینی جذبہ رکھتی ہیں اور اسلام آباد میں دو مقامات پر انھوں نے خواتین کے حلقہ ہائے درسِ قرآن قائم کر رکھے ہیں۔ شوہر اور بیوی دونوں کے مذہبی ذوق کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا ایک بچہ آٹھ برس کی عمر میں حفظِ قرآن سے فارغ ہو چکا ہے اور دوسرا اب کر رہا ہے گویا ڈاکٹر صاحب سے مل کر راقم کو دوہری خوشی ہوئی۔ ایک خوشی وہ جس کا ذکر کسی نے ان الفاظ میں کیا ہے ؎

اے دوست کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے!

اور دوسری وہ جس کی تصویر مولانا حالی نے کھینچی ہے۔ یعنی ؎

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں!

اسی سفر میں ایک تقریر راولپنڈی میں ریلوے آفیسرز کلب میں بھی ہوئی جس میں نہ صرف یہ کہ ریلوے کے آفیسر حضرات نے بہت بڑی تعداد میں شرکت فرمائی بلکہ برادرم اسلم تزئین صاحب بھی اپنے بہت سے رفقائے ساتھ

ٹیکسلا سے آکر شریک ہوئے۔

ان دو بڑے بڑے سفروں کے علاوہ دو چھوٹے چھوٹے دعوتی سفر قلب پنجاب کے بھی ہوئے۔ ایک مرحوم حمید نظامی کے مولد سانگلہ ہل کا جہاں ایک تقریر گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج میں ہوئی اور دوسرا منٹگمری (حال ساہیوال) اور پاکپتن کا، جس کے دوران میں ایک تقریر منٹگمری کے ایک دینی مدرسے میں ہوئی اور دوسری پاکپتن کی ایک مسجد میں جس میں مقامی گورنمنٹ کالج کے اساتذہ کی اکثریت برادرم شیر محمد شاہ صاحب کی معیت میں شریک تھی۔

ان سب پر مستزاد ہے ایک زاید بر پروگرام (OUT OF SCHEDULE) سفر کراچی کا جو کراچی ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی اس دعوت پر کرنا پڑا کہ ۱۳ مئی کی سہ پہر کو منعقد ہونے والے اجلاس سیرت النبیؐ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے خطاب کروں۔ چونکہ رفقائے کراچی کا بھی شدید اصرار تھا کہ یہ دعوت ضرور قبول کی جائے اور بار کے بعض عہدیداران حضرات کا بھی بہت محبت بھرا تقاضا تھا لہٰذا حاضری ہوئی اگرچہ طبیعت میں قدرے گھبراہٹ کا احساس بھی ہوتا تھا کہ ملک کے چوٹی کے اصحاب علم و فضل کے اجتماع میں خصوصاً جناب اے کے بروہی اور جناب خالد اسحٰق ایسے اہل دانش کے سامنے خطاب! ع

[illegible]

لیکن بحمد اللہ بات پورے سکون کے ساتھ اور کامل دلجمعی کے ساتھ ہوئی چنانچہ بہت سے حضرات نے محسوس کیا کہ ایک پیغام مکمل سامنے آیا ہے لہٰذا بعد میں بہت دیر تک گفت و شنید اور افہام و تفہیم کا سلسلہ چلتا رہا۔

رفقائے کراچی نے [illegible] اپنا حق وصول کر لیا چنانچہ ایک نشست درس قرآن کی بعد نماز عشا مسجد قدسی جمشید روڈ میں منعقد ہوئی اور ایک خطاب قبل از نماز جمعہ پیر الٰہی بخش کالونی کی ایک جامع مسجد میں 'حقیقت توحید' کے موضوع پر ہو گیا۔

ادھر مقامی طور پر لاہور میں بھی اس دوران میں درس قرآن اور خطابات جمعہ کے مستقل پروگرام کے علاوہ کچھ اضافی و غیر معمولی پروگرام بنتے رہے، مثلاً سیرت النبیؐ کے موضوع پر ایک تقریر ایچی سن کالج لاہور میں ہوئی اور ایک اندرون فصیل الوالہ دروازہ[1] 'حقیقت جہاد' اور 'حقیقت نفاق' کے موضوع پر دو تقاریر مسجد دارالسلام باغ جناح (لارنس گارڈن) میں ہوئیں اور ایک تقریر اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ میں اساتذہ، طلبہ اور معززین علاقہ کے مشترکہ اجتماع میں ہوئی ——— وقس علیٰ ہذا

الغرض ——— بفحوائے آیات قرآنی

(بقیہ صفحہ ۱۳ پر دیکھئے)

---

[1] یاد آیا کہ سیرت ہی کے موضوع پر ایک تقریر سینیٹ ہال پنجاب یونیورسٹی میں بھی ہوئی تھی۔

نشری تقریر
اسرار احمد

اسلام کے مشعل بردار
حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

یہ تقریر ریڈیو پاکستان کے لاہور سٹیشن سے اتوار ۲۳ مئی ۱۹۷۶ء کی سہ پہر کو "صراط مستقیم" نامی پروگرام میں نشر کی گئی

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور تاریخ ہند کے اس دور میں ہوا، جب ہندوستان میں بسنے والی امت مسلمہ کا دینی و اخلاقی زوال بھی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور برصغیر میں مسلمانوں کے چھ صد سالہ اقتدار کا قصر بھی بوسیدہ اور مضمحل ہو چکا تھا اور یہ عظیم الشان اور فلک بوس عمارت منہدم ہوا چاہتی تھی!

چنانچہ ایک طرف سلطنت مغلیہ کے زوال اور حضرت اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد سیاسی طور پر طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا اور امراء و سلاطین کی عظیم اکثریت فسق و فجور اور لہو و لعب میں بدمست ہونے کے علاوہ باہمی افتراق و انتشار اور جنگ و جدال کا شکار بھی تھی، دوسری طرف علماء کی اکثریت نہ صرف یہ کہ دنیا پرستی کی لعنت میں مبتلا تھی بلکہ انہوں نے دین و مذہب کو جذبہ و روح سے عاری کر کے محض ایک خشک قانونی و فقہی نظام کی حیثیت دے دی تھی۔ تیسری طرف صوفیاء کے طبقے میں شریعت اسلامی سے آزادی ہی نہیں بیزاری کا رجحان غالب تھا اور انہوں نے ہندی و یونانی نظریات کی آمیزش سے تصوف اسلامی کے چشمۂ صافی کو گدلا کر دیا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ ان حالات میں عوام الناس کا تو کہنا ہی کیا، وہ بقول حضرت عبد اللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے ؎

«وَمَا اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلَّا الْمُلُوْکُ وَ اَحْبَارُ سَوْءٍ وَ رُھْبَانُھَا»

اور بقول شاعر مشرق "اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری" ان تینوں طبقات کی برائیوں کے جامع بن گئے تھے۔

امت کا یہ زوال و اضمحلال فطری طور پر اغیار و اعداء کے مذموم ارادوں کی تقویت کا موجب بن رہا تھا

چنانچہ پایۂ تخت کے قرب و جوار میں روز افزوں جاٹوں کی یورش کے علاوہ برصغیر میں بیک وقت تین فتنے تین مختلف سمتوں سے قلب مملکت کی جانب یلغار کے لئے پر تول رہے تھے۔ یعنی ایک[1] مشرق سے انگریزی استعمار کا عفریت جس نے ابتداءً تو تجارت کا لبادہ اوڑھا تھا لیکن ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی کے بعد سے ایک عسکری قوت کی حیثیت سے کم از کم بنگال میں قدم جمائے تھے۔ دوسرا[2] شمال سے یعنی سکھوں کی یورش جس نے ابتداءً مذہبی اصلاح کے پردے میں قدم جمائے تھے لیکن اب دفعتہً عسکری صورت اختیار کر لی تھی اور تیسرے[3] جنوب سے مرہٹوں کی یورش کا عظیم فتنہ جو ابتدا ہی سے بالکل عریاں تھا اور جس کی قیادت ابتدا ہی سے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی اور[4] جو مسلمانوں سے چھ صد سالہ غلامی کا بدلہ لینے کے عزائم بد کے ساتھ دوسرے دونوں فتنوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیزی و تندی کے ساتھ تاخت و تاراج کرتا ہوا قلب مملکت تک پہنچ چکا تھا۔

یہ تھے وہ حالات جن میں ۱۷۰۳ء میں دہلی کے ایک روشن ضمیر اور "خود آگاہ و خدامست" انسان شاہ عبدالرحیم کے گھر میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے آنکھ کھولی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، سات سال کی عمر میں حفظ قرآن سے فارغ ہوئے اور پندرہ سال کی عمر میں مجلہ علوم عقلیہ و نقلیہ سے فراغت حاصل کر لی۔ بعد ازاں حج بیت اللہ اور زیارت حرمین شریفین سے بھی مشرف ہوئے اور وہاں کے علمی و روحانی سلسلوں سے بھی فیض حاصل کیا اور تیس سال سے بھی کم عمر میں اپنے عظیم الشان اصلاحی و تجدیدی کام کا آغاز کر دیا۔

مجددین اسلام کی فہرست میں امام الہند کا نام نامی بلاشبہ بہت بلند مقام پر ہے اور یہ کہنا غلط نہیں کہ وہ دور جدید کے فاتح اور ملت اسلامی کی نشاۃ ثانیہ کے نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شاہ صاحب کی تجدیدی مساعی میں اوّلین اہمیت علمی و فکری اصلاح اور طریق تعلیم و تعلّم کی تطہیر اور تنظیم نو کو حاصل ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں اسلام ابتدا ہی سے ایک خالص قانونی و فقہی نظام کی حیثیت سے آیا اور اس کا تعلق اپنے اصل سرچشموں یعنی قرآن اور حدیث سے محض بالواسطہ رہا نتیجتہً حکمتِ دین کا ظہور کما حقہٗ نہ ہو سکا لہٰذا شاہ صاحب نے اوّلین کوشش یہی کی کہ مسلمانوں کا تعلق علم و حکمت دینی کے ان

---

[1] واضح رہے کہ سیواجی کا تعلق بھی اودے پور کے رانا خاندان سے بتایا جاتا ہے اور اس کے بعد تو مرہٹہ تحریک کی قیادت براہ راست کوکنی پنڈتوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی۔ اس میں ایک گہری مماثلت ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک سے جس کی قیادت میں اوّلاً جنوبی ہند کے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کا پلڑا بھاری رہا۔

اصل خزانوں سے بلا واسطہ قائم ہو جائے۔

چنانچہ ایک طرف انہوں نے بہ نفس نفیس قرآن حکیم کا ایک نہایت عمدہ ترجمہ سلیس فارسی میں کیا اور ان کے جلیل القدر صاحبزادگان میں سے دو نے قرآن مجید کے اردو ترجمے کئے یعنی شاہ رفیع الدین صاحب نے لفظی اور شاہ عبدالقادر صاحب نے بامحاورہ۔ اور کون نہیں جانتا کہ قرآن مجید کے تمام اردو تراجم کا سلسلہ نسب بالآخر انہی دو ترجموں سے جا ملتا ہے۔ دوسری طرف شاہ صاحب نے ایک مختصر لیکن نہایت وقیع رسالہ "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" کے نام سے رقم فرمایا جس نے مفہم قرآن کی راہیں کھول دیں اور قرآن حکیم پر غور و فکر کے صحیح طریق کی نشاندہی کی۔

مزید برآں شاہ صاحب نے حدیث نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم و تدریس پر زور دیا اور خود نہ صرف یہ کہ مؤطا امام مالک رح کی دو شرحیں تلمیذ کیں یعنی ایک مسوّیٰ بزبان عربی اور دوسری مصفّیٰ بزبان فارسی بلکہ ایک عظیم تصنیف یعنی "حجۃ اللہ البالغہ" کے ذریعے احادیث نبوی کی ایک بڑی تعداد کی علمی قدر و قیمت کو اجاگر کیا اور اس حکمت تشریع کی نشاندہی کی جو شریعتِ اسلامی کی پشت پر کارفرما ہے۔

شاہ صاحب کی یہ عظیم تصنیف ان کے اجتماعیات انسانی کے مسائل دقیقہ کے گہرے فہم پر دلالت کرتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اسے جدید عمرانیات کے لئے "اُمّ الکتاب" قرار دیا جا سکتا ہے! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب آج سے دو ڈھائی سو سال قبل ان مشکل مسائل و پیچیدہ معاملات کا کتنا صحیح فہم و شعور رکھتے تھے جو تمدن و عمرانیات کے میدان میں آج کے انسان کو درپیش ہیں۔

تاریخ اسلامی کے صدر اوّل اور نظام خلافت کے متعلق جو غلط فہمیاں عام ہو گئی تھیں ان کے ازالے کے لئے شاہ صاحب نے "ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفاء" اور "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین" ایسی عظیم الشان کتب تصنیف فرمائیں۔

ان سب پر مستزاد ہیں ان کی وہ دقیق تصانیف جو فلسفہ، حکمت اور تصوف کے غوامض سے بحث کرتی ہیں اور جن کا فہم عام لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں غلط فہمیاں عام ہیں۔

اس علمی اصلاح و تجدید کے ساتھ ساتھ جسے عالم اسلام میں یورپ کی "تحریک احیاء العلوم" (RENAISSANCE) کے بالکل ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحب ایک روشن ضمیر اور بیدار مغز انسان کی طرح اردگرد کے حالات کا جائزہ بھی لیتے رہے اور متذکرہ بالا فتنوں کا صحیح صحیح اندازہ کرتے ہوئے ان کی روک تھام کے لئے تدابیر پر غور فرماتے رہے۔ سکھوں کا فتنہ اپنی تمام تر وحشت و بربریت کے باوصف ابھی صرف پنجاب تک محدود تھا، تاہم بعد میں شاہ صاحب کے پوتے شاہ اسمٰعیل شہید نے اسی

خانوادۂ علمی و روحانی کے ایک فیض یافتہ حضرت سید احمد بریلوی کی معیت میں جو پنجہ آزمائی اس فتنے سے کی اسے بہرحال شاہ صاحب ہی کے فیض کا تسلسل قرار دیا جائے گا۔ انگریزی استعمار کا فتنہ بھی ابھی قلبِ مملکت سے قدرے دور تھا[1]۔ البتہ مرہٹہ یورش کی تاخت و تاراج پایۂ تخت تک پہنچ چکی تھی لہٰذا شاہ صاحب نے اوّلیں اہمیت اسی کو دی اور یہ دراصل انہی کی دعوت پر ہوا کہ احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان کا قصد کیا اور ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری اور عظیم ترین جنگ میں مرہٹوں کو شکست فاش دی اور اس فتنے کی کمر توڑ کر رکھ دی۔

علامہ اقبال مرحوم نے حضرت مجدّد الف ثانی کے بارے میں فرمایا تھا کہ ؎

"وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!"

یہ بات جتنی صحیح حضرت مجدّد الف ثانی کے بارے میں ہے اتنی ہی صحیح امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے لئے بھی ہے۔

معرکۂ پانی پت کے دو سال کے اندر اندر بارھویں صدی ہجری کا یہ مجدّدِ دینِ حق بحساب قمری کُل ساڑھے اکسٹھ سال کی عمر میں واصل بحق ہو گیا۔ رَحِمَہُ اللّٰہُ تعالیٰ وادخلہٗ فی اعلیٰ علیّین!

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین!

---

[1] تاہم اس فتنے سے بھی بعد میں علمائے دیوبند خصوصاً مولانا محمود حسن رح اور ان کے رفقاء و تلامذہ مثلاً مولانا حسین احمد مدنی رح اور مولانا عبید اللہ سندھی جس طرح نبرد آزما رہے یہ بھی حقیقتاً سلسلۂ ولی اللّٰہی ہی کی ایک کڑی ہے۔

ایک اہم اعلان
انجمن خدّام القرآن کراچی

کا دفتر جو تا حال فرید چیمبرز وکٹوریہ روڈ پر قائم تھا اب بعض وجوہات کی بنا پر عارضی طور پر پتہ ذیل پر تبدیل ہو گیا ہے

۲۴ جاپان مینشن ۲ متصل ریگل سینما و کیفے جہاں، پریڈی سٹریٹ، صدر، کراچی ۳

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ کہف

۵

۱۰۔ آگے کا مضمون، (آیات ۶۰ ـــــ ۸۲)

صبر کی عقائدی بنیادیں

پیچھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اعدائے حق اور مستکبرین کے مقابل میں جس صبر و استقامت کی تلقین کی گئی ہے آگے کی آیات میں اسی مضمون کی تکمیل کر دی گئی ہے۔ گویا سورہ اس مقام پر اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ صبر کے متعلق یہ بات یاد رکھیئے کہ یہ کوئی منفی چیز نہیں، بلکہ ایک مثبت حقیقت ہے۔ اسی پر تمام حق کے قیام و بقا کا انحصار ہے۔ جس کے اندر یہ صفت راسخ نہ ہو وہ نہ تو خدا کا حق ادا کر سکتا نہ بندوں کا۔ اس صفت کو واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی عقائدی بنیادیں دل کے اندر راسخ ہوں۔ جب تک یہ بنیادیں اچھی طرح راسخ نہ ہوں صبر کو اوپر سے چپکایا نہیں جا سکتا۔ یہ عقائدی بنیادیں تین ہیں:۔

ایک یہ کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے سب خدا کے اِذن اور اس کے ارادہ و مشیت کے تحت واقع ہوتا ہے۔ اس کے اذن و ارادہ کے بغیر ایک ذرّہ بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا۔

دوسری یہ کہ خدا خیرِ مطلق اور حکیم ہے اس وجہ سے اس کا کوئی ارادہ بھی خیر اور حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ اگر اہلِ باطل کو ڈھیل دیتا ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ باطل سے محبت کرتا یا اس کے آگے بے بس اور مجبور ہے بلکہ اس کے اندر بھی وہ کسی خیرِ عظیم کی پرورش کرتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ اہلِ حق کو مصائب و آلام میں مبتلا کرتا ہے تو اسلئے نہیں کہ اسے اہلِ حق کے مصائب سے کوئی دلچسپی ہے بلکہ وہ اس طرح ان کے لیے کسی بڑے خیر کی راہیں کھولتا ہے۔

تیسری یہ کہ انسان کے علم کی رسائی محدود ہے اس وجہ سے وہ خدا کے ہر ارادہ کی حکمت کو اس دنیا میں نہیں معلوم کر سکتا۔ اس کے ارادوں کے تمام اسرار صرف آخرت ہی میں بے نقاب ہوں گے۔ اس دنیا میں

انسان کیلئے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ خدا کے تمام فیصلوں پر صابر و شاکر رہتے ہوئے اپنا فرض ادا کرے اور مطمئن رہے کہ آج کی تلخیوں کے اندر جو شیرینی چھپی ہوئی ہے اس کے روح افزا انجام انشاء اللہ کل سامنے آئیں گے۔

حضرت موسیٰؑ کا ایک تربیتی سفر

اس کائنات کے اس رمز کو سمجھنے کے لیے یہاں حضرت موسیٰؑ کے ایک تربیتی سفر کی سرگزشت سنائی گئی ہے۔ حکمت کے اسرار و دقائق زندگی میں جس طرح متصور ہو کر سامنے آتے ہیں مجرد اظہار و بیان سے اس طرح سامنے نہیں آتے۔ حضرت موسیٰؑ کو اصلاح و تربیت کے لیے جو قوم ملی تھی وہ نہایت کمزور اور بودی تھی اور جس دشمن سے ان کا سابقہ تھا وہ نہایت جبار و قہار تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی حکمت مقتضی ہوئی کہ وہ صبر میں نہایت راسخ اور پختہ ہو جائیں تاکہ مخالف حالات کا پورے عزم و جزم کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ چنانچہ خدا نے ان کو اپنے ایک ایسے بندے کے پاس بھیجا جس کو اس نے کچھ خاص علم عطا فرمایا تھا۔ اس بندے نے حضرت موسیٰؑ پر خدا کے حکم سے اس کے ارادوں کے چند اسرار بے نقاب کئے جو تربیت صبر و رضا کے پہلو سے نہایت اہم تھے۔

مفسرین کی ایک غلط فہمی

ہمارے نزدیک حضرت موسیٰؑ کے اس سفر کا مقصد یہی تھا لیکن بعض مفسرین نے معلوم نہیں کہاں سے یہ فضول سی بات لکھ دی ہے کہ نعوذ باللہ حضرت موسیٰؑ ترنگ میں آ کر کسی دن یہ کہہ بیٹھے تھے کہ اس وقت مجھ سے بڑا عالم کوئی نہیں ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بطور تادیب و تنبیہ ان کو اپنے ایک بندے کے پاس بھیجا کہ وہ دیکھ لیں کہ ان سے بھی بڑا ایک عالم موجود ہے۔ اوّل تو حضرت موسیٰؑ ایسی بے محل بات فرماتے کیوں اور اگر انہوں نے فرمائی تو یہ کوئی غلط بات تو نہیں فرمائی۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ نبی اپنے زمانہ کا سب سے بڑا عالم ہوتا ہے اور وہ اپنی پوری قوم کے سامنے اس حقیقت کا آشکارا طور پر اعلان بھی کرتا ہے۔ یہ بات ہر نبی نے اپنی قوم سے کہی ہے کہ 'انی اعلم من اللہ مالا تعلمون' کہ اے میری قوم کے لوگو! میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ لیکن کسی نبی کی یہ بات نہ تو فخر و تعلّی پر محمول کی گئی اور نہ اس کی بنا پر وہ مستوجب تادیب قرار پایا تو آخر حضرت موسیٰؑ ہی اس کے سبب سے کیوں سزاوار تنبیہ ٹھہرے؟ بہرحال یہ شانِ نزول بالکل لایعنی ہے اصل حقیقت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ اب اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے:-

ترجمہ آیات ۶۰-۸۲

اور یاد کرو، جب کہ موسیٰؑ نے اپنے شاگرد سے کہا کہ میں چلتا رہوں گا یہاں تک کہ یا تو دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر پہنچ جاؤں یا اسی طرح سال ہا سال چلتا ہی رہوں گا۔ پس جب وہ ان کے ملنے کی جگہ پہنچا تو وہ اپنی مچھلی بھول گئے اور اس نے دریا میں اپنی راہ لی۔ پس جب وہ آگے بڑھ گئے تو موسیٰؑ نے اپنے شاگرد سے کہا کہ اب ہمارا کھانا لاؤ، ہمارے اس سفر سے تو ہم کو بڑی تکان ہو گئی۔ اس نے کہا، آپ نے دیکھا نہیں کہ جب ہم نے چٹان کے پاس پناہ لی تو میں مچھلی کو بھول گیا، اور یہ شیطان ہی تھا جس نے اس کو یاد رکھنے سے مجھے غافل کیا، اور اس نے عجیب طرح اپنی راہ

دریا میں نکال لی۔ اس نے کہا، یہی تو ہمیں مطلوب تھا! پس وہ اپنے نقش قدم دیکھتے ہوئے واپس لوٹے تو انہوں نے پایا ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو جس کو ہم نے اپنے خاص فضل سے نوازا تھا اور جس کو خاص اپنے پاس سے علم عطا فرمایا تھا۔ ۶۱ - ۶۵

موسیٰؑ نے اس سے درخواست کی کہ کیا میں آپ کے ساتھ اس شرط پر رہ سکتا ہوں کہ جو علم آپ کو عطا ہوا ہے آپ اس میں سے کچھ مجھے بھی سکھائیں؟ اس نے جواب دیا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے اور آخر جو باتیں تمہارے دائرہ علم سے باہر رہیں گی ان پر تم سے صبر ہو بھی کیسے سکے گا! اس نے کہا انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔ میں کسی معاملے میں بھی آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ ۶۶ - ۶۹

اس نے کہا اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو یہ شرط ہے کہ کسی چیز کے متعلق مجھ سے اس وقت تک کچھ نہ پوچھیو جب تک میں خود ہی اس کا کچھ ذکر نہ چھیڑوں۔ بالآخر وہ دونوں چلے یہاں تک کہ جب وہ کشتی میں سوار ہوئے تو اس نے اس میں چھید کر دیا۔ موسیٰؑ نے کہا کیا یہ چھید آپ نے اس میں اس لیے کیا ہے کہ اہل کشتی کو غرق کر دیں؟ یہ تو آپ نے بڑی ہی عجیب حرکت کی! اس نے کہا، میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ ضبط نہ کر سکو گے! موسیٰ نے کہا میری بھول چوک پر مواخذہ نہ کیجیے اور میرے معاملہ میں زیادہ سخت گیری نہ فرمائیے۔ ۷۰ - ۷۳

پھر چلے، یہاں تک کہ جب ایک لڑکے سے ملاقات ہوئی تو اس نے اس کو قتل کر ڈالا۔ موسیٰ نے کہا آپ نے ایک معصوم جان کو بغیر کسی قصاص کے قتل کر ڈالا! یہ تو آپ نے بڑی ہی منکر بات کی! اس نے کہا، میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے! موسیٰ نے کہا، اب اس کے بعد اگر میں آپ سے کسی امر کے متعلق پوچھوں تو مجھے ساتھ نہ رکھیے گا۔ آپ میری جانب سے حد عذر کو پہنچ گئے۔ پھر چلے یہاں تک کہ جب پہنچے ایک بستی والوں کے پاس تو ان سے کھانا کھلانے کی درخواست کی لیکن انہوں نے ان کی میزبانی سے انکار کر دیا۔ تو انہوں نے وہاں ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی، وہ دیوار اس نے کھڑی کر دی۔ موسیٰ نے کہا اگر آپ چاہتے تو اس پر کچھ مزدوری بھی ٹھہرا لیتے۔ اس نے کہا بس اب میرے اور تمہارے درمیان یہ جدائی ہے۔ میں اب تمہیں ان باتوں کی حقیقت بتاؤں گا جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ ۷۴ - ۷۸

کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے، میں نے چاہا کہ اس کو عیب دار کر دوں اور ان کے پرے ایک بادشاہ تھا جو تمام کشتیوں کو

زبردستی ضبط کر رہا تھا۔ ۷۹

رہا لڑکا تو اس کے ماں باپ باایمان تھے۔ ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ بڑا ہو کر سرکشی و ناشکری سے ان پر تعدی نہ کرے۔ پس ہم نے چاہا کہ ان کا رب ان کو اس کی جگہ ایک ایسا فرزند عطا فرمائے جو پاکیزہ نفسی میں اس سے بہتر اور مروت و دردمندی میں اس سے بڑھ کر ہو۔ ۸۰-۸۱

اور رہا دیوار کا معاملہ تو وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی۔ اس کے نیچے ان کا دفینہ تھا۔ اور ان کا باپ ایک صالح آدمی تھا۔ ہمارے رب نے یہ چاہا کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا دفینہ نکالیں۔ یہ تیرے رب کی عنایت سے ہوا۔ اور یہ جو کچھ میں نے کیا اپنی رائے سے نہیں کیا۔ یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ ۸۲

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِفَتٰهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰیٓ اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا ۝۶۰

(فتیٰ کا مفہوم)

'فتیٰ' کا ترجمہ میں نے 'خادم'، 'نوجوان' یا 'لڑکے' کے بجائے شاگرد کیا ہے۔ اس میں فی الجملہ 'جوان' ہونے کا مفہوم بھی آجاتا ہے اور حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اس جوان کے تعلق کی نوعیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے اس مہم میں رفاقت کے لیے جن الفاظ میں اس جوان سے استمزاج کیا ہے اس سے یہی متبادر ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت محض ایک نوکر کی نہیں بلکہ ایک نوجوان صحابی کی تھی جو حضرت موسیٰؑ کے شاگرد بھی تھے اور ان کی خدمت بھی کرتے تھے۔

(مجمع البحرین)

'مجمع البحرین' سے مراد غالباً خلیج عقبہ اور سویز کا وہ مقام اتصال ہے جہاں سے بعد کے مراحل میں حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کے ساتھ گزرے ہیں۔

(حقب)

'حُقُبًا' کے معنی زمانہ، سال، ۸۰ سال، یا اس سے بھی زیادہ کی مدت کے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کو اس سفر کی ہدایت ظاہر ہے کہ وحی کے ذریعہ سے ہوئی ہوگی۔ انہوں نے اس کا اظہار اپنے شاگرد سے کیا اور ان کے لفظ لفظ سے اس سفر کے لیے ان کا عزم و جزم اور ذوق و شوق ٹپک رہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں یا تو مجمع البحرین میں اس مقام تک پہنچ جاؤں گا جہاں پہنچنے کے لیے مجھے ہدایت ہوئی ہے یا پھر اسی منزل مقصود کی تلاش میں سال ہا سال گزار دوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہمت ہے تو اس سفر میں ساتھ

دو ورنہ یہ بندہ تو بہرحال اس محبوب سفر پر روانہ ہو رہا ہے اور اس عزم کے ساتھ روانہ ہو رہا ہے کہ ؎

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ۝۶۱

'سرب' کے معنی برتن سے پانی کے بہہ جانے کے ہیں۔

ایک عجیب واقعہ

یہاں سرگزشت کا بہت سا حصہ حذف ہے جو قرینہ سے واضح ہے یعنی دونوں نے سفر کیا اور مجمع البحرین پہنچ گئے۔ یہاں ذرا دم لینے کے لیے ایک پہاڑی کے دامن میں بیٹھے، پھر وہاں سے چلے تو ناشتہ کے لیے جو مچھلی ساتھ لی تھی وہ ساتھ لینا بھول گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد، معلوم ہوتا ہے، شاگرد کو یہ بات یاد آئی اور وہ مچھلی لینے کے لیے واپس لوٹے لیکن یہاں پہنچے تو دیکھا کہ مچھلی نے ان کے سامنے تڑپ کر پانی کی راہ لی۔ یہ واقعہ اتنا عجیب تھا کہ شاگرد نے غالباً اس اندیشہ سے حضرت موسیٰؑ سے ذکر کرنے کی جرأت نہیں کی کہ وہ اتنی عجیب و غریب بات باور نہیں کریں گے اور عجب نہیں کہ ان کے عتاب شدید سے دوچار ہونا پڑے چنانچہ آگے کو چل پڑے۔ شاگرد اس حیص بیص میں پڑا رہا کہ اس واقعہ کا ذکر کروں یا نہ کروں اور حضرت موسیٰؑ نے خیال فرمایا ہوگا کہ شاگرد نے بھولی ہوئی مچھلی اٹھالی ہوگی۔

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ آتِنَا غَدَاءَنَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَٰذَا نَصَبًا ۝۶۲

'غداء' کے معنی ناشتہ اور نہاری کے ہیں اور 'نصب' کے معنی تکان کے۔ یہاں 'غداء' کا لفظ اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ مچھلی بھنی ہوئی تھی۔ بے بھنی ہوئی یا زندہ مچھلی کے لیے 'غداء' کا لفظ کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

غداء

بالآخر جب وہاں سے کچھ دور نکل گئے تو حضرت موسیٰؑ نے شاگرد سے کہا کہ بھئی! اس سفر نے تو تھکا دیا اب ناشتہ لاؤ تو کچھ کھا لیا جائے۔

قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنْسَانِيهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا ۝۶۳

شاگرد کی معذرت

مجبوراً شاگرد کو راز سے پردہ اٹھانا پڑا۔ جھجکتے اور ڈرتے ہوئے بولے کہ کیا عرض کروں جب ہم نے پہاڑی کے دامن میں پناہ لی تھی تو میں وہیں مچھلی بھول آیا تھا اور یقیناً یہ شیطان ہی کی حرکت

تھی کہ میں اس کو یاد رکھنے سے قاصر رہا۔ پھر جا کے دیکھا تو مچھلی نے نہایت حیرت انگیز طریقہ سے دریا میں اپنی راہ نکال لی۔

'ارائیت' کا لفظ یہاں قائل کی جھجک کو ظاہر کرتا ہے۔ جیسے ہم بولتے ہیں 'کیا عرض کروں' 'ذرا دیکھئے تو سہی'، 'وما انسانیہ الا الشیطان' کے الفاظ نہایت شائستہ الفاظ میں اپنی کوتاہی کی معذرت کے لیے ہیں۔

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۚ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ۝

شاگرد نے تو بات ڈرتے ڈرتے بتائی کہ یہ سن کر معلوم نہیں کیا عتاب نازل ہو لیکن حضرت موسیٰؑ یہ مژدہ سن کر پھڑک اٹھے۔ فرمایا اسی کی تو تلاش تھی! معلوم ہوتا ہے کہ وحی یا رویا کے ذریعہ سے حضرت موسیٰؑ کو منزل مقصود کا سراغ یہی بتایا گیا تھا کہ جس مقام پر ان کے ناشتہ کی مچھلی زندہ ہو کر پانی کی راہ لے گی وہیں ان کی ملاقات اس بندۂ خاص سے ہو گی جو ان پر زندگی کے کچھ خاص راز فاش کرے گا۔ چنانچہ وہ یہ سراغ پاتے ہی الٹے پاؤں، اپنے نقش قدم کو تلاش کرتے اس مقام پر واپس آئے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔

منزل کا سراغ

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۝

یہاں ان کی ملاقات ایک خاص بندے سے ہوئی جس پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا اور جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ خاص علم سے نوازا تھا۔ یہ کون تھے؟ قرآن نے ان کا نام نہیں بتایا ہے، صرف ان کے بعض مخصوص اوصاف کا ذکر کیا ہے۔ بعض حدیثوں میں ان کا نام خضر آیا ہے۔ چونکہ ان حدیثوں کے انکار کی کوئی وجہ ہمارے پاس نہیں ہے اس وجہ سے یہی نام ہم اختیار کر لیتے ہیں۔

حضرت خضرؑ سے ملاقات

حضرت خضرؑ نبی تھے

حضرت خضرؑ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی تھے۔ اس کا اول قرینہ تو یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر نبی بلکہ رسول کو ان کے پاس حصول علم اور حصول تربیت کے لیے بھیجا گیا۔ اگر حضرت خضرؑ نبی نہیں تھے تو ایک نبی کا غیر نبی کے پاس حصول علم و تربیت کے لیے بھیجا جانا بالکل ناموزوں سی بات ہے۔ اگرچہ اس نام کے کسی نبی کا ذکر قرآن یا تورات میں نہیں ملتا لیکن یہ چیز کچھ اہمیت رکھنے والی نہیں ہے۔ قرآن میں، خود اس کی اپنی تصریح کے مطابق، بہت سے انبیاء کا ذکر نہیں ہے۔ یہی حال تورات کا بھی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، اپنے ہر نبی کو کسی نہ کسی پہلو سے

فضیلت دی ہے۔ حضرت خضرؑ کو بھی ایک خاص پہلو سے فضیلت حاصل تھی اور اسی طرح حضرت موسیٰؑ کو بھی فضیلت حاصل تھی۔ حضرت موسیٰؑ کا ان سے کچھ باتیں سیکھنا اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ ان کو حضرت موسیٰؑ پر مطلق فضیلت حاصل تھی۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ ان کے جو اوصاف اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں وہ حضرات انبیاء ہی سے مناسبت رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ 'وہ ہمارے بندوں میں سے ایک خاص بندہ تھا۔' 'ہم نے اپنی طرف سے اس پر خاص فضل کیا تھا۔' 'ہم نے اس کو اپنے پاس سے ایک خاص علم عطا کیا تھا۔' علیٰ ہذا القیاس انہوں نے خود اپنے کاموں سے متعلق فرمایا کہ 'میں نے کوئی کام بھی خود اپنی رائے سے نہیں کیا بلکہ خدا کے حکم سے کیا ہے۔' یہ سب باتیں دلیل ہیں کہ وہ صاحب وحی نبی تھے اور ان کو یہ خاص امتیاز بھی حاصل تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے بعض ارادوں کے راز کھول دیئے تھے۔

قَالَ لَهُ مُوسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ۶۶ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۶۷ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ۶۸

'رُشد' کے معنی علم و حکمت کے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد وہ خاص علم ہے جو اسرار کائنات سے متعلق اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر کو بخشا۔ حضرت موسیٰ نے ان سے درخواست کی کہ اگر آپ اس علم خاص میں سے' جو اللہ نے آپ کو بخشا ہے، مجھے بھی کچھ سکھائیں تو کچھ عرصہ اپنی خدمت میں مجھے رہنے کی اجازت دیجئے۔ حضرت خضرؑ نے فرمایا کہ مجھے اجازت سے تو انکار نہیں ہے لیکن تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے۔ میرے ہاتھوں ایسے کام صادر ہوں گے جن کے بھید اور جن کی حکمت سے تم واقف نہیں ہو گے اور وہ کام تمہاری نگاہوں میں عجیب اور ناگوار ہوں گے تو آخر تم ان پر کس طرح صبر کرو گے؟

قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ۶۹

حضرت موسیٰؑ نے وعدہ کیا کہ انشاء اللہ آپ مجھے ہر مرحلہ پہ صابر پائیں گے اور میں ہرگز آپ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ۷۰

حضرت خضر نے اس وعدے کے بعد اس شرط پہ ان کو اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی کہ جو کچھ وہ کریں اس کو چپ چاپ وہ دیکھتے رہیں، اس کے متعلق اس وقت تک وہ کوئی سوال نہ کریں

جب تک حضرت خضرؑ اس کو خود نہ چھیڑیں۔

فَانْطَلَقَا حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا ۭ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـــًٔا اِمْرًا ۝

'اِمر' کے معنی عجیب اور منکر کام کے ہیں۔

کشتی کا واقعہ

اس قول و قرار کے بعد دونوں اپنے تربیتی سفر پر چلے اور ایک کشتی پر سوار ہوئے۔ کشتی پر سوار ہونے کے بعد خضرؑ نے کسی جگہ سے کشتی کا کوئی تختہ توڑ کر اس کو عیب دار کر دیا۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰؑ سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ اپنے قول و قرار کو نظر انداز کر کے بول اٹھے کہ یہ حرکت کیا آپ نے اس لیے کی ہے کہ اہل کشتی کو غرق کر دیں، یہ تو بڑی ہی نارو احرکت آپ نے کی!۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ۝

'ارھاق' کے معنی کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنا، کسی کو مبتلائے آفت کرنا، 'ارھقہ عسرًا' کے معنی ہوں گے اس کو تنگی میں ڈال دیا۔

خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنی بات یاد دلائی کہ میں نے نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے! حضرت موسیٰؑ نے فوراً معذرت کی کہ بھول ہوئی، معاف کیجئے، میرے معاملہ میں زیادہ سخت گیری سے کام نہ لیجئے۔

فَانْطَلَقَا ۠ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـــًٔا نُّكْرًا ۝

پھر کہیں کو چلے۔ راستہ میں ایک لڑکا ملا۔ خضرؑ نے اس کو قتل کر دیا۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰؑ پھر بپھر گئے۔ بولے یہ آپ نے کیا کر ڈالا، ایک معصوم کو بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو، آپ نے قتل کر ڈالا۔ یہ تو آپ نے بڑی بھونڈی حرکت کی!

لڑکے کے قتل کا واقعہ

حضرت خضرؑ نے پھر ان کو اپنی بات یاد دلائی کہ کیا میں نہیں کہہ چکا ہوں کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے۔ حضرت موسیٰؑ نے پھر معافی مانگی اور کہا کہ اگر میں اس کے بعد کوئی سوال کروں تو آپ کو حق ہو گا کہ آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں۔ پھر آپ میری طرف سے معذور ہوں گے۔

حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِۨ اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ۝

پھر آگے کو چلے، یہاں تک کہ ایک بستی میں پہنچے۔ بھوکے تھے اس وجہ سے بستی والوں سے کچھ کھلانے

بستی والوں کا واقعہ

کی فرمائش کی۔ شریف لوگ بن کہے بھی مسافروں کی میزبانی ایک سعادت سمجھتے ہیں لیکن اس بستی کے لوگ ایسے لئیم نکلے کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ جیسے دو شریف مسافروں کو، ان کی درخواست پر بھی، روٹی دینے سے انکار کر دیا۔ ان کی اس کمینگی کے باوجود حضرت خضرؑ نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ ان کی بستی کی ایک دیوار، جو گرا چاہتی تھی، محنت کر کے درست کر دی۔ آخر حضرت موسیٰؑ سے اس پر بھی نہ رہا گیا۔ انہوں نے ٹوکا کہ ان نااہلوں اور کمینوں کے لیے آپ نے یہ محنت بے مزدوری برداشت کی؟ اور کچھ نہیں تو ان سے اس محنت کی کچھ مزدوری ہی ٹھہرا لیتے! حضرت خضرؑ نے فرمایا کہ بس جناب اب حجت تمام ہو چکی۔ اب میرے اور آپ کے درمیان جدائی کا فیصلہ ہے۔ آئیے میں ان باتوں کی حقیقت آپ کو بتاتا ہوں جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔ قرینہ دلیل ہے کہ حضرت خضرؑ نے جدائی کا یہ اعلان صرف اس بنا پر نہیں کیا کہ حضرت موسیٰؑ پر، خود ان کے اقرار کے مطابق، حجت تمام ہو چکی تھی بلکہ حکمت کی وہ تعلیم بھی مکمل ہو چکی تھی جو حضرت موسیٰؑ کو وہ دینا چاہتے تھے۔

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُّ
أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ۝

واقعہ اول کی حکمت

اب یہ حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنے ایک ایک فعل کی وہ حکمت بتائی جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ فعل کرائے۔

کشتی کے اندر چھید کرنے کی حکمت یہ بتائی کہ یہ کشتی مسکینوں کی تھی جو اسی کے ذریعہ سے دریا میں محنت مزدوری کر کے اپنے پیٹ پالتے تھے۔ پرے ایک بادشاہ تھا جو علاقہ کی تمام کشتیوں کو غالباً اپنی کسی جنگی مہم کے لیے زبردستی قبضہ میں کر رہا تھا۔ حضرت خضرؑ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ چاہا کہ مسکینوں کی اس کشتی کو عیب دار کر دوں تاکہ بادشاہ اپنے مقصد کے لیے اس کو ناکارہ سمجھ کر اس پر قبضہ نہ کرے اور یہ غریب اپنی معاش کے اس واحد ذریعہ سے محروم ہونے سے محفوظ رہیں۔

یہ مثال ہے اس امر کی کہ دنیا میں غریبوں، مسکینوں اور نیکوں کو اگر کوئی مالی و معاشی نقصان پہنچتا ہے تو اس نقصان کے اندر انہی کا کوئی فائدہ مضمر ہوتا ہے اس لیے انہیں چاہیے کہ اس پر صبر کریں، اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی رہیں اور اس امر پر یقین رکھیں کہ خدا کا کوئی فیصلہ بھی حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا لیکن کوئی شخص ان حکمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا
وَكُفْرًا ۝ فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِنْهُ زَكَاةً

وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ۝

اقرب رحما

'رُحم' کے معنی رقتِ قلب، ہمدردی اور محبت و شفقت کے ہیں۔ خيرا منه زكوٰة و اقرب رحما، یعنی طبیعت اور اخلاق کی پاکیزگی کے اعتبار سے اس سے بہتر اور دردمندی اور مروت کے اعتبار سے اس سے زیادہ پاس و لحاظ والا۔

لڑکے کے قتل کی حکمت

اب یہ لڑکے کے قتل کی حکمت بتائی کہ اس کے ماں باپ مومن تھے اور یہ کفر پر اٹھنے والا تھا، ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ جوان ہو کر ماں باپ کو اپنی سرکشی و نا سپاسی سے مبتلائے اذیت کرے گا۔ ہم نے چاہا کہ اس سرکش و نافرمان کی جگہ اللہ ان کو ایسی اولاد دے جو پاک نفس اور ہمدردی کرنے والی ہو۔

یہ مثال ہے اس بات کی کہ اہلِ ایمان کو اگر کوئی مصیبت جانی پہنچتی ہے تو اس میں بھی ان کے لیے کوئی خیر عظیم مضمر ہوتا ہے جس کو صرف اللہ ہی جانتا ہے اس وجہ سے اہلِ ایمان کو چاہیے کہ وہ اس پر صبر کریں جس دن اس کی حکمت واضح ہو گی معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ خدا نے کیا اسی میں خیر و فلاح تھی۔

وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝ ۸۲

دیوار کی مرمت کی حکمت

اب یہ ان یتیموں کی بستی کی ایک گرتی ہوئی دیوار کی مرمت کے لیے، بلا کسی معاوضے کے، انہوں نے جو زحمت برداشت کی اس کی حکمت سمجھائی کہ یہ دیوار درحقیقت دو یتیموں کی تھی، ان کے باپ نے، جو ایک نیک آدمی تھا، اس کے نیچے ایک دفینہ محفوظ کیا تھا کہ اس کے بعد یہ اس کے بچوں کے کام آئے گا۔ اگر یہ دیوار گر جاتی تو یہ دفینہ بستی کے لٹیروں کے ہاتھ لگ جاتا اور یہ یتیم اس سے محروم ہو جاتے۔ اس وجہ سے تمہارے رب نے یہ چاہا کہ یہ دیوار ان بچوں کے جوان ہونے تک قائم رہے تاکہ وہ جوان ہو کر اپنا دفینہ خود نکالیں۔ یہ درحقیقت تمہارے رب نے ان یتیموں پر رحم فرمایا ہے نہ کہ اس بستی کے لوگوں پر۔

'ما فعلته عن امری' آخر میں حضرت خضرؑ نے یہ تصریح بھی فرما دی کہ ان کاموں میں سے کوئی کام بھی انہوں نے اپنی رائے سے نہیں کیا ہے بلکہ ہر کام خدا کے حکم سے کیا ہے۔

یہ مثال ہے اس بات کی کہ اس دنیا میں نابکاروں اور ناہنجاروں کو جو رعایت ملتی ہے اس سے قدرت کا اصل منشا نابکاروں کی پرورش کرنا نہیں ہوتا ہے بلکہ ان کے پردے میں قدرت اپنی ہی مصلحت خیر کی پرورش کرتی ہے اگرچہ اس کا علم ہمیں نہیں ہوتا۔ اس قسم کی رعایتوں سے اشرار تو اپنے اوپر صرف خدا

کی حجت پوری کراتے ہیں۔ البتہ خدا ان کے ہاتھوں اہلِ حق کو نکھارتا ہے اور وہی اس دنیا کی خلقت کی اصل غایت ہیں۔

۱۲۔ اس مجموعۂ آیات کے بعض ضمنی فوائد

حضرت موسیٰؑ کی اس سرگزشت کی اصل حکمت کی طرف تو ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں لیکن اس کے بعض ضمنی فوائد بھی قابلِ توجہ ہیں۔ ہم بالاختصار ان کی طرف بھی توجہ دلا دینا چاہتے ہیں۔

حکمت صرف طالب صادق کو ملتی ہے

پہلی بات یہ ہے کہ جس چیز کو حکمت کہتے ہیں ہر مدعی اس کا اہل نہیں ہوتا بلکہ یہ صرف طالب صادق کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ حلوائی کی دکان کا حلوا نہیں ہے کہ جس کے جیب میں پیسے ہوں، اس کو خرید سے بلکہ اس کے لیے بڑا ریاض کرنا پڑتا ہے۔ یہ گھر بیٹھے بیٹھے حاصل نہیں ہو جاتی بلکہ بسا اوقات اس کی خاطر کسی خضرِ راہ کی تلاش میں ستو باندھ کر خشکی و تری کا سفر کرنا پڑتا ہے اور امکان اس کا بھی ہے کہ ساری عمر اس سفر ہی میں بیت جائے۔ یہ کوچۂ عشق ہے جس میں درجے اور مرتبے کے رکھ رکھاؤ سے دست بردار ہو کر سر کے بل جانا پڑتا ہے۔ اس کی خاطر اپنی انانیت قربان کرنی پڑتی ہے۔ جب تک کوئی شخص یہ قربانی دینے کے لیے تیار نہ ہو وہ اس راہ میں قدم بھی نہ رکھے۔ یہ خیرِ کثیر کا خزانہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے صرف ان لوگوں کے لیے خاص کیا ہے جو حکمت و معرفت کے سوا ہر خواہش و آرزو سے دستکش ہو جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کی اس سرگزشت میں یہ ساری باتیں از خود اس طرح واضح ہیں کہ ان کے دلائل نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ ہمارے لیے اصل رہنما شریعت ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہر حال میں ہم اسی کی پیروی کریں اور اگر کسی کی کوئی بات اس کے خلاف دیکھیں تو اس پر نکیر کریں اگرچہ اس کا ارتکاب حضرت خضرؑ جیسے مرشد ہی سے کیوں نہ ہوا ہو۔ چنانچہ دیکھیے حضرت موسیٰؑ باوجودیکہ حضرتؑ کے پاس اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے گئے تھے لیکن انہوں نے ان کی کسی ایسی بات پر صبر نہیں کیا جس کو انہوں نے شریعت کے خلاف پایا۔ حضرت موسیٰؑ مطمئن اس وقت ہوئے ہیں جب حضرت خضرؑ نے ان کو یہ اطمینان دلایا ہے کہ جو کچھ انہوں نے کیا ہے حکمِ خداوندی کی تکمیل میں کیا ہے، کوئی بات بھی اپنے جی سے نہیں کی ہے اور حضرت خضرؑ کی اس بات پر بھی ان کو اطمینان مجرد ان کے کہنے پر نہیں ہوا بلکہ وحی الٰہی کے ذریعہ سے ان کو پہلے سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حضرت خضرؑ خدا کے خاص بندے ہیں، وہ جو کچھ بھی کریں گے، خدا کے حکم کے مطابق کریں گے۔

اقطاب و ابدال کا تصور بے بنیاد ہے

اس وجہ سے ہم ان لوگوں کی بات بالکل بے سروپا سمجھتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہر دور میں حضرت خضر کی طرح کچھ اقطاب و ابدال ہوتے ہیں جو بجائے خود حق و باطل کی کسوٹی ہوتے ہیں۔ ان کی باتیں شریعت پر نہیں پرکھی جاتیں

کیونکہ ان کے کام براہ راست ارادۂ الٰہی کے تحت ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اقطاب و ابدال کی یہ اصطلاحات ایک قلم باطل ہیں۔ قرآن و حدیث میں ان کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن فرض کر لیجئے کہ کوئی شخص قطب ابدال ہے تو ہم اس کی خلاف شریعت باتوں کو کس طرح گوارا کر سکتے ہیں؟ حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضرؑ کی باتیں تو جیسا کہ معلوم ہوا، اس لیے گوارا فرمائیں کہ وحی کے ذریعہ سے ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ حضرت خضرؑ نے جو کچھ کیا ہے حکم خداوندی کی تعمیل میں کیا ہے لیکن ہمارے پاس کسی کے متعلق یہ معلوم کرنے کا کیا ذریعہ ہے کہ وہ قطب ابدال ہے اور اس کو خدا نے اپنی شریعت کی خلاف ورزی کا اختیار دیا ہے؟ خدا کی مرضیات و احکام معلوم کرنے کا واحد ذریعہ ہمارے پاس کتاب و سنت ہے اس وجہ سے کوئی قطب و ابدال صاحب تو درکنار اگر خواجہ خضرؑ بھی آج آجائیں اور کسی کو قتل کرکے یہ صفائی پیش کریں کہ یہ انہوں نے خدا کے حکم کی تعمیل میں کیا ہے تو ہم ان کے عذر کو رد کرکے ان کے قتل کا فتویٰ دے دیں گے۔ اس لیے کہ ہمارے پاس 'النفس بالنفس' کا حکم قرآن میں موجود ہے لیکن خواجہ خضرؑ کے کسی قتل کا خدا کی طرف سے مجاز ہونے کا ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔

تیسری چیز اس میں اسلوب بیان کا ایک اشکال ہے جو غور کرنے والے کے ذہن میں خلجان پیدا کرتا ہے۔ وہ یہ کہ ایک طرف تو حضرت خضرؑ اپنے ان تمام کاموں کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ (ما فعلتہ عن امری) (میں نے ان میں سے کوئی کام بھی اپنی رائے سے نہیں کیا ہے۔) لیکن دوسری طرف کشتی کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ 'فاردت ان اعیبھا' میں نے یہ چاہا کہ اس کو عیب دار کر دوں؛ پھر لڑکے کے باب میں ارشاد ہوتا ہے کہ 'فخشینا' پس ہم کو اندیشہ ہوا۔ 'فاردنا' پس ہم نے ارادہ کیا۔ پھر دیوار کے معاملہ میں کہتے ہیں کہ 'اراد ربک' تیرے رب نے ارادہ کیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی بات انہوں نے مختلف اسلوبوں سے کیوں فرمائی؟ جب انہوں نے سب کچھ خدا کے حکم کی تعمیل میں کیا تو اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے واضح اسلوب 'اراد ربک' کا تھا، پھر یہ کہنے کے کیا معنی کہ 'میں نے چاہا کہ اس کو عیب دار کر دوں'۔ علاوہ ازیں یہ سب کچھ کیا تو تھا تنہا حضرت خضرؑ نے تو آگے جمع کا صیغہ 'اردنا' کیوں استعمال کیا؟ اگر یہ فرض کیا جائے کہ اس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کو بھی شامل کر لیا ہے تو اس سلسلہ میں 'خشینا' کا لفظ جو استعمال ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل ہی ناموزوں ہے۔ خدا کو کسی چیز کا اندیشہ ہونے کے کیا معنی؟ ان شبہات کے ازالہ کے لیے مندرجہ ذیل امور پیش نظر رکھیے۔

ایک یہ کہ جب بندہ کا ارادہ بعینہٖ وہی ہے جو خدا کا ارادہ ہے تو وہ اس کو خدا کی طرف بھی منسوب کر سکتا ہے اور اپنی طرف بھی۔ اس میں اگر فرق ہوتا ہے تو محض بلاغت کے کسی تقاضے کے تحت ہوتا ہے۔

بعض شبہات کا ازالہ

مثلاً بعض مرتبہ حسن ادب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ایک بات کو خدا کی طرف نسبت دینے کے بجائے بندہ خود اپنی طرف اس کو منسوب کرے۔ مثلاً یہاں کشتی میں چھید کرنے کا معاملہ فی الظاہر چونکہ ذرا بدنما تھا اس وجہ سے اس کو حضرت خضرؑ نے اپنی طرف منسوب کیا۔ اور یتیموں کے دفینہ کو محفوظ کرانے کا معاملہ چونکہ فی الظاہر بھی اچھا تھا اس وجہ سے اس کو براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا۔

دوسری یہ کہ اس طرح کے مواقع میں جب متکلم اپنے لیے جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے تو گویا وہ اس پورے زمرہ کے قول یا ارادہ کی ترجمانی کرتا ہے جس کے نمائندے یا جس کے آلہ و جارحہ کی حیثیت سے وہ کسی کام کو انجام دیتا ہے۔ حضرت خضرؑ نے یہ سارے کام چونکہ کارکنان قضا و قدر کے ایک آلہ و جارحہ کی حیثیت سے انجام دیئے اس وجہ سے وہ اس کو تعبیر کرنے کے لیے جمع کا صیغہ بھی استعمال کر سکتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس طرح وہ فعل تنہا ان کا فعل نہیں رہا۔ بلکہ جملہ کارکنان قضا و قدر کا فعل بن گیا۔

تیسری یہ کہ یہاں 'خشینا' کا جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے تعلق سے نہیں استعمال ہوا ہے بلکہ اس کو حضرت خضرؑ نے خاص اپنے اجتہاد کی تعبیر کے لیے استعمال کیا ہے۔ وحی یا فرشتہ کے ذریعہ سے ان کو جو حکم ہوا تھا وہ یہ تھا کہ فلاں لڑکے کو قتل کر دو اس لیے کہ اس کے ماں باپ مومن ہیں اور یہ کافر و ناہنجار اٹھے گا۔ اس حکم سے خود حضرت خضرؑ نے یہ استنباط فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکا اپنے ماں باپ پر تعدی کرے گا اس وجہ سے اس کے قتل کا حکم ہوا ہے، یہ ان کا اپنا استنباط تھا۔ اس کی تصریح اصل حکم الٰہی میں نہیں تھی، اس وجہ سے حضرت خضرؑ نے اس کو اپنے ایک اندیشہ کی حیثیت سے ذکر کیا اور اس کے لیے 'خشینا' کا لفظ استعمال کیا۔

کراچی میں
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
کی جملہ مطبوعات بشمول ماہنامہ 'میثاق' کے لیے
دفتر انجمن خدام القرآن کراچی
۲۴- جاپان مینشن ۲، پریڈی سٹریٹ، صدر، کراچی ۳
یا فون نمبر ۲۳۸۸۱۳ سے رجوع فرمائیں

مطالعۂ قرآن کی بنیادی شرط

سید مشکور حسین یاد

(قرآن کانفرنس منعقدہ لاہور دسمبر ۱۹۷۳ء میں پڑھا گیا)

میں سمجھتا ہوں مطالعہ قرآن کی بنیادی شرط یہ ہے کہ جس وقت انسان اس کتاب عظیم کو پڑھنے بیٹھے تو پورے یقین کے ساتھ یہ سمجھے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ آپ فرمائیں گے واہ صاحب یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ میں جواباً عرض کروں گا کہ حضور والا! یہ تو میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ لیکن معلوم ہونے میں یعنی علم میں اور یقین میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ علم زمین ہے تو یقین آسمان۔ یہ بالکل الگ بحث ہے کہ دُور افق پر دیکھنے سے ہمیں زمین اور آسمان ملتے ہوئے نظر آئیں اور ہماری نظریں دھوکہ کھا جائیں۔ کچھ اسی طرح عام طور پر لوگ علم اور یقین کو ایک سمجھ لیتے ہیں اور اپنی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ علم اور یقین سے متعلق ہمارا یہ افقی رویہ (HORIZONTAL ATTITUDE) اپنے دامن میں بے شمار خطرات رکھتا ہے۔ میں آج آپ کے سامنے مسلمانوں کے اسی رویے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں ورنہ آپ جانتے ہیں علم اور یقین سے متعلق خالصتاً اسلامی رویہ قطعی طور پر عمودی یعنی VERTICAL ہوا کرتا ہے۔ علم یقین کے دائرہ اثر میں آجائے تو یہ اسے مقناطیس کی طرح سیدھا اپنی طرف کھینچتا ہے اور یہ سیدھی لکیر زمین سے اٹھتی ہے تو آسمانوں کی آخری حد تک کھنچتی چلی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کسی کلمہ طیبہ کے درخت کی جڑیں زمین میں پیوست ہوتی ہیں لیکن اس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوتی ہیں۔

علم و یقین سے متعلق ہمارے اس افقی رویے کی یوں تو بہت سی مضحکہ خیز اور دردانگیز صورتیں موجود ہیں لیکن میں ان میں سے فی الحال بہت پیش پا افتادہ قسم کی ایک دو صورتوں کا ذکر کرنا کافی سمجھوں گا۔

مطالعہ قرآن کے ضمن میں ہمارے اس رویے کی ناخواندہ لوگوں میں صورت حال یہ ہے کہ وہ قرآن کو یہاں تک اللہ کا کلام مانتے ہیں کہ اُسے بغیر سمجھے پڑھنا تو بڑی بات ہے اُس کے اوراق کی ہوا کھانا ہی کافی خیال کرتے ہیں اور بہت سے گھروں میں تو محض قرآن کا کتابی صورت میں موجود ہونا اُن کے لئے باعث برکت ہوتا ہے تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک بھی اسی صورت حال کی ایک پریشان کر دینے والی شق ہے۔ یہ تو تھی ناخواندہ لوگوں کی بات۔ دوسری مضحکہ خیز صورت کا تعلق ہمارے خواندہ لوگوں سے ہے۔ اور یہ خواندہ لوگ بھی معمولی تعلیم یافتہ نہیں بلکہ عام سطح سے زیادہ پڑھے لکھے لوگ —— ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ قرآن کو اللہ کا کلام تو ضرور خیال کرتے ہیں لیکن اُن کا ذوقِ تجسس انہیں ان سوالات میں اُلجھائے رکھتا ہے کہ آیا ہمارے نبی کریمؐ پر قرآن معنی اور الفاظ کے ساتھ بیک وقت نازل ہوا یا پہلے معنی اُترے اور پھر الفاظ نے ترتیب پائی۔ اس بحث وتحقیق میں ان لوگوں کے ذوقِ تجسس کو کہاں تک تسکین حاصل ہوتی ہے اس کا جواب تو مجھ سے اور آپ سے زیادہ وہ لوگ خود جان سکتے ہیں لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کے علم کو یقین کی سعادت کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں ناخواندہ لوگوں کی صورت حال ایسی تشویش ناک اور لاعلاج نہیں۔ ان لوگوں کو ذرا تربیت اور خواندگی سے فیض یاب کیا جائے تو یہ اپنے آپ کو سیدھی راہ پر لانے میں بہت جلد کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اصل مسئلہ تو خواندہ اور تعلیم یافتہ لوگوں کا ہے۔ ناخواندہ لوگوں کے منفی رویّے کے عقب میں سیدھی سادی جہالت کارفرما ہوتی ہے۔ لیکن خواندہ لوگوں کے اس رویّے کو غذا دینے والی چیز ان کی تعلیم ہے۔ اور وہ بھی مانگے تانگے کی تعلیم۔ مجھے اس وقت ایک واقعہ یاد آرہا ہے ابھی دو تین ہفتے قبل کی بات ہے ہمارے ایک مشہور صحافی دوست کی شادی کا ولیمہ تھا وہاں ہر قسم کے بڑے لوگ مدعو تھے۔ اردو کے ایک بزرگ [illegible] وہ معروف ادیب اشناد نے میرا بازو پکڑ کر نہایت رازدارانہ انداز میں مجھ سے پوچھا [illegible] شکور! ایک سوال کرتا ہوں جواب دو گے؟" میں نے عرض کیا" آپ میرے استاد ہیں اگر جواب بن پڑا تو ضرور کچھ نہ کچھ کہنے کی جرأت کروں گا" میں نے دیکھا کہ موصوف کی آنکھوں میں عجیب قسم کی افسردگی اور اداسی جھلک رہی ہے جسے مایوسی کہہ دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ فرمانے لگے "یہ سب کچھ کیا ہے؟ ہماری زندگی اور اس کائنات کے کوئی معنی ہیں یا یہ سارا کھڑاگ فضول اور بیکار ہے" میں نے کہا" جناب آپ نے مجھ سے زیادہ مطالعہ کیا ہے آپ کا تجربہ بھی مجھ سے کہیں بڑھ کر ہے آپ نے یقیناً مجھ سے زیادہ سوچا بھی ہوگا لیکن آپ کے سوال کے جواب میں جو چیز فوراً میرے ذہن میں آتی ہے وہ عرض کئے دیتا ہوں" کہنے لگے "ہاں ہاں جلدی بتاؤ" میں نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا خلقنا السّمٰوٰتِ والارضَ وما بینھما لٰعبین ۝ میں نے اپنی دانست میں بڑا TO THE POINT جواب دیا تھا لیکن موصوف نے سنی ان سنی کر دی فرمانے لگے" امتیاز علی تاج مرحوم

بھی اپنی زندگی کے آخری دنوں میں خاصے کرب میں تھے وہ بھی کہا کرتے تھے آخر اس تمام زندگی اور کائنات کے وجود میں آنے کا کیا مطلب و مفہوم ہے ؟ میں نے عرض کیا "جناب میں تو ایک عام آدمی ہوں خواہ مخواہ سوچ کی الجھنوں میں پڑنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ مجھے تو اس آیہ مبارکہ نے اکثر اندھیروں سے نکال کر اجالوں کی دنیا دکھائی ہے" فرمانے لگے "کون سی آیت ذرا پھر پڑھنا" میں نے دوبارہ آیت مذکور پڑھی وما خلقنا السمٰوات والارض وما بینھما لٰعبین۔ کہنے لگے " اچھا اچھا اور سناؤ کیا حال ہے۔ واضح رہے کہ یہ بزرگ صرف اردو فارسی کے عالم نہیں موصوف کو عربی اور قرآنیات سے بھی خاص شغف حاصل رہا ہے۔ اس پہ ان کا یہ حال ہے۔ ہمارے خواندہ لوگوں کے علم و یقین سے متعلق افقی رویے کی یہ ایک ادنیٰ اور محدود قسم کی مثال سمجھیے۔

علم و یقین سے متعلق ہم نے یہ افقی رویہ کیوں اختیار کیا اس صورت حال کو ذرا وسیع پس منظر میں دیکھا جائے تو کچھ اس طرح کی بات بنتی ہے۔ آج کل تعلیم یافتہ فضا میں جس انسانی رویے کو بہت مستحسن خیال کیا جاتا ہے وہ سائنٹیفک ایٹی چوڈ (SCIENTIFIC ATTITUDE) ہے۔ ذرا غور سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کا یہ رویہ کوئی نیا نہیں ہے بلکہ اولاد آدم کو جیسے ہی شعور کی پہلی کرن ملی ہوگی اس نے اسی رویے کو اختیار کر لیا ہوگا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ سائنٹیفک ایٹی چوڈ انسان کا خالص انسانی رویہ یعنی PURE HUMAN ATTITUDE نہیں ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ انسانی رویے سے زیادہ حیوانی رویہ ہے اگر سائنٹیفک ایٹی چوڈ کے یہی معنی ہیں کہ جو چیز ہمارے حواس کی گرفت میں آجائے وہ حقیقت ہے تو یقین کیجئے حیوانات ہم سے زیادہ سائنٹیفک زندگی گزارتے ہیں۔ حواس کے وسیلے سے پہنچی ہوئی حقیقتوں پر [illegible] حیوانات کو ہوتا ہے سچ پوچھیے تو اس کا عشر عشیر بھی انسان کو حاصل نہیں۔ سائنٹیفک ایٹی چوڈ جہاں انسان کے [illegible] اس کے خود سر ہونے کی طرف بھی واضح اشارہ کرتا ہے، دراصل اس رویے کی بدولت بظاہر تو انسان مادہ پہ فوقیت حاصل [illegible] جائے تو اس کے پیچھے مطلق العنان ہونے کی خواہش کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مادیت کی حد تک تو سائنٹیفک ایٹی چوڈ کی کوئی ذی عقل مخالفت نہیں کرے گا۔ لیکن مادہ سے آگے بڑھنے کے لئے اس رویے کو یقیناً پس پشت ڈالنا ہوگا۔ اسلام نے سائنٹیفک ایٹی چوڈ کو حد اعتدال میں رکھنے کے لئے نہایت عمدہ اور بے مثال روش اختیار کی ہے یعنی وہ ایک طرف تو زمین و آسمان پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے اور دوسری طرف ایمان بالغیب کی نہایت اہم شرط عائد کرتا ہے۔ اہل دنیا نام نہاد سائنٹیفک ایٹی چوڈ کو اپنا کر کس قدر پریشان ہوئے اور ہو رہے ہیں انہیں اس رویے کی وجہ سے کتنا گمراہ ہونا پڑا اور ہونا پڑ رہا ہے۔ ہمیں فی الحال اس سے غرض نہیں۔ ہمارے دل کو تو اُس وقت صدمہ پہنچتا ہے جب ہم مسلمانوں کو اس رویے کا شکار ہوتے دیکھتے ہیں۔ زمین پہ پاؤں جمانے

کی سعی کرنا کوئی بُری بات نہیں لیکن زمین پر پاؤں اس قدر جم جائیں کہ اگلا قدم نہ اُٹھ سکے۔ یہ امر دین کی روح کے سراسر منافی ہے۔ ہمیں اس عظیم حقیقت کو کسی طرح فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ جس طرح آئیڈیل کے لئے REAL ضروری ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ REAL کے لئے آئیڈیل اہم ہوتا ہے REAL کے سامنے آئیڈیل نہ رہے تو اس کا انتقا خاک سے آگے نہیں بڑھتا۔ سائنٹیفک ایٹی چوڈ کی راہ میں سب سے نازک اور کٹھن مرحلہ انسان پر اسی وقت آتا ہے جب REAL کی چمک دمک اس کی آنکھوں کو اس قدر خیرہ کر دیتی ہے کہ ان میں آئیڈیل کو دیکھنے کی تاب باقی نہیں رہتی بلکہ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وہ REAL ہی کو آئیڈیل سمجھنے لگتا ہے اور اس طرح اس پر زندگی کی بے شمار نعمتوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

قرآن میں حقیقتوں تک پہنچنے کے عمودی رویّے کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہاں علم سے پہلے یقین کے قدم آگے بڑھتے ہیں۔ یقین کے قدم آگے بڑھیں تو اللہ کے کلام کی تمام عظمتیں دل پر منکشف ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ قرآن کا انسان سے بالواسطہ اور بلا واسطہ بلندیوں کی طرف لے جاتا ہوا پُرخلوص خطاب، اس کا روزِ روشن کی طرح نور برساتا ہوا طریق استدلال، اس کی تشبیہات کی لافانی تابانی، اس کے استعارات کا بیمثال جلال و جمال، اس کے آہنگ کی قوت و شرافت، اس کے فرہنگ کی تمازت و طراوت، اس کے معانی کا دریائے سبک خرام اور سب سے بڑھ کر حقیقت کُل سے انسان کی قربت کا کیف آور احساس یہ اور اسی قبیل کے دوسرے محاسن چشم زدن میں پڑھنے والے کے دل و دماغ پر واضح ہوتے چلے جاتے ہیں۔ قرآن کی ان جملہ خوبیوں کا ادراک ایک عام قاری کو بھی ہو سکتا ہے جسے اس کے اللہ کے کلام ہونے پر یقین نہیں۔ لیکن اس ادراک میں دیر بھی لگے گی اور دقت بھی پیش آئے گی اور اگر ادراک ہو بھی جائے گا تو مکمل طور پر نہیں ہوگا ایک مسلمان کے محض زبان کے کہنے سے کہ یہ اللہ کا کلام ہے کچھ حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اس علم کو یقین کی صورت دے کر اپنی رُوح کا حصہ نہیں بنا لیتا۔ لیکن ایسا کرنے سے اس کی حقیقت پسندی کو، مادہ پرستی کو زبردست دھچکا پہنچتا ہے جسے وہ شخص کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا جس کے پاؤں زمین میں کچھ زیادہ ہی دھنس گئے ہیں۔ اس جد و جہد میں ہمیں نہ صرف اپنے اُفقی رویّہ کے فریب سے نکلنا ہوتا ہے بلکہ نام نہاد سائنٹیفک ایٹی چوڈ کو بھی ایک طور سے خیرباد کہنا پڑتا ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو یاد رکھیے قرآن ہمارے لئے کسی صورت میں بھی کافی وشافی نہیں ہو سکتا۔ یہ دنیا اور اس کی حقیقتیں ہمارے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ ہماری منزل نہیں ہے ہمیں یقیناً اس سے آگے جانا ہے لیکن آگے بڑھنے کے لئے ہمیں اپنے رویّوں کو تبدیل کرنا ہوگا ان رویّوں کو جو ابھی تک ایّام جاہلیت کے رویّوں سے کچھ زیادہ مہذب نہیں ہو سکے ہیں۔

مقالات

ڈاکٹر عبدالبصیر پال سابق صدر
شعبہ طبیعیات پنجاب یونیورسٹی

قرآن اور سائنس

قرآن کانفرنس منعقدہ لاہور، دسمبر ۷۳ء میں پڑھا گیا

صدر محترم، علمائے کرام اور معزز حاضرین!

اس مقالے میں پہلے یہ بتایا جائے گا کہ قرآنی تعلیم کی فضا میں سائنس کے پودے نے کیسے نشو و نما پائی۔ پھر اس بات کی وضاحت کی جائے گی کہ قرآن پاک میں جو ٹھوس اور ابدی حقیقتیں بیان کی گئی ہیں جدید سائنس ان کی کیسے پُر زور تائید کرتی ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا قول ہے اور کائنات اس کا فعل۔ پس سائنس اور قرآن پاک میں مطابقت کا پایا جانا ایک لازمی امر ہے۔

۱: سائنس کی نشو و نما

پرانے زمانے میں سائنس کا چراغ اہل بابل اور اہل مصر نے روشن کیا تھا۔ انہوں نے جو علم، تجربوں سے حاصل کیا اسے تجربی علم (EMPIRICAL KNOWLEDGE) کہتے ہیں۔ اس علم کا فائدہ یہ ہے کہ اس کی مدد سے بہت سی مفید چیزیں مثلاً رنگ، شیشہ، دھاتیں، دوائیاں وغیرہ تیار کی جا سکتی ہیں۔ اس کے بعد یونانی دور آیا جس میں مشہور یونانی حکیموں مثلاً افلاطون اور ارسطو نے انسانی علم میں نمایاں اضافہ کیا۔

پہلی صدی عیسوی میں یورپ کا بیشتر حصہ رومی سلطنت میں شامل تھا۔ اس عظیم سلطنت میں عیسائیت آہستہ آہستہ پھیلنے لگی اور چوتھی صدی عیسوی کے آخر میں عیسائیت کو رومی سلطنت کا سرکاری مذہب تسلیم کر لیا گیا۔ پانچویں صدی میں رومی سلطنت اندرونی طور پر کمزور ہو گئی اور سارا یورپ آزاد ہو گیا لیکن یورپ کے تمام عیسائی پوپ (POPE) کو اپنا روحانی پیشوا مانتے تھے۔ پادریوں نے عوام کو پہلے یہ بتایا کہ تمام دینی اور دنیوی علوم انجیل مقدس میں موجود ہیں اور جو کچھ اس پاک کتاب کے

باہر ہے وہ باطل ہے۔ پھر سائنس کا پڑھنا ممنوع قرار دیا گیا اور یونانی کتابوں کو کارِ خیر سمجھ کر نذرِ آتش کر دیا گیا۔ چنانچہ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں سائنس کا چراغ گل ہو گیا اور سارے یورپ پر جہالت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ تعلیم صرف عیسائی خانقاہوں تک محدود تھی جن میں فقط عیسائیت پڑھائی جاتی تھی۔

عین اس تاریکی کے زمانے میں عرب کے صحرا سے ایک آواز اٹھی۔ یہ پیغمبر اسلامؐ کی ندائے حق تھی۔ سرورِ کائناتؐ نے فرمایا:۔

۱: علم حاصل کرو، خواہ اس کے لئے تمہیں چین جانا پڑے۔

۲: جو شخص علم کی تلاش کے لئے سفر کرتا ہے خدا اسے جنت کا راستہ دکھاتا ہے۔

۳: عالم کی سیاہی شہید کے خون سے زیادہ مقدس ہے۔

۴: حکمت کی بات مومن کی گم شدہ چیز ہے جہاں سے اس کا حق ہے۔

قرآن پاک کی جو آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں ان میں بھی علم کا ذکر تھا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ
اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ
مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ (العلق آیات ۱ تا ۵)

البقرہ کی آیت ۲۶۹ میں حکمت کو "خیراً کثیراً" کہا گیا ہے۔ فرشتوں پر آدم کی فضیلت اس "علم" کی وجہ سے ہے جو خدا نے اپنے خاص فضل و کرم سے آدمؑ کو عطا کیا تھا۔

قرآنی تعلیم اور احادیث نبویؐ نے مسلمانوں میں علم حاصل کرنے کا ایک غیر معمولی شوق پیدا کر دیا چنانچہ آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر تیرھویں صدی کے وسط تک کا زمانہ علم و حکمت یا سائنس کا ایک اسلامی دور تھا جس میں بڑے بڑے نامور دانشور پیدا ہوئے مثلاً جابر بن حیان، محمد بن زکریا رازی، ابن الہیثم، البیرونی، بوعلی سینا، عمر خیام، الفارابی اور ابن رشد۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے عیسائی سائنس کی کتابوں کو نذرِ آتش کرنا ایک کارِ خیر سمجھتے تھے یونانی علم و حکمت کی بے شمار کتابیں اسکندریہ کی لائبریری میں پائی جاتی تھیں۔ بدقسمتی سے اس لائبریری کو چھٹی صدی عیسوی میں جلا دیا گیا۔ اسلام نے دنیا پر ایک بڑا احسان یہ کیا کہ ارسطو اور دیگر یونانی دانشوروں کو گمنامی کے عالم سے نکالا۔ اس ضمن میں حمید عسکری مرحوم نے اپنی کتاب "نامور مسلم سائنسدان" میں ایک دلچسپ حکایت بیان کی ہے۔ مامون رشید نے اپنے "بیت الحکمت" کے لئے یونانی کتابیں حاصل کرنے کے لئے رومی شاہنشاہ

کو ایک خط بھیجا کیونکہ قدیم یونانی مملکت کے سارے علاقے اس زمانے میں رومی سلطنت میں شامل تھے رومی شاہنشاہ کو بڑی ندامت اور مایوسی ہوئی کیونکہ شاہی فرمان کے باوجود اس کے اراکین سلطنت کئی دن کی مسلسل کوشش کرنے کے بعد ایک بھی یونانی کتاب حاصل نہ کر سکے۔ خوش قسمتی سے ایک بوڑھے پادری نے خبر دی کہ پرانی یونانی کتابوں کا ایک ذخیرہ فلاں شہر کے بڑے گرجے میں ایک تہہ خانہ میں بند ہے۔ اس ذخیرے میں کچھ کتابیں اچھی حالت میں تھیں۔ انہیں مامون رشید کے پاس بھیجنے سے پہلے رومی شاہنشاہ نے لاٹ پادری سے پوچھا کہ ان کتابوں کو مسلمانوں کے خلیفہ کے پاس بھیجنا کوئی معیوب بات تو نہیں ہے؟ لاٹ پادری کا جواب قابل غور ہے :

" ہرگز نہیں بلکہ الٹا حضور کو بہت بڑا ثواب ملے گا کیونکہ آپ ہمارے مخالفوں کو ایسی اشیا بھیج رہے ہیں جو حقیقت میں اتنی مضر ہیں کہ ہم انہیں آگ کی نذر کر دینا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔"

افسوس اور صد افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں نے سائنس کی قدر دانی کی شاندار روایت کو بھلا دیا، اور کفار سائنس کے میدان میں ہم سے صدیوں آگے نکل گئے۔ اگر قرآن پاک نازل نہ ہوتا تو آج ارسطو کو کون جانتا؟ مسلمانوں نے ارسطو کو تو زندہ کر دیا لیکن سائنس کی شمع کو کفار کے حوالے کر دیا۔

اسلام نے دنیا پر ایک دوسرا بڑا احسان یہ کیا کہ سائنس میں تحقیق کا ایک صحیح طریقہ بتایا۔ یونانی دانشور یہ خیال کرتے تھے کہ سائنسی اصول دریافت کرنے کے لئے محض غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن مسلم دانشوروں کے نزدیک جو اصول محض غور و فکر سے دریافت کئے جائیں وہ صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ کسی اصول کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے تجربے کی کسوٹی پر پرکھا جائے اس طریقے کو اختباری طریقہ (EXPERIMENTAL METHOD) کہتے ہیں۔ یہ طریقہ مسلم دانشوروں کی اپنی طبع زاد دریافت ہے۔ سائنس کی ترقی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ غور و فکر کے ساتھ ساتھ مناسب تجربے بھی کئے جائیں۔ غور و فکر اور مناسب تجربوں کے ملاپ سے ہی تحقیق کا ایک قابل اعتماد اور صحیح طریقہ مرتب ہوتا ہے، اس طریقے کو جس میں غور و فکر اور تجربے کا ملاپ ہو سائنسی طریقہ SCIENTIFIC METHOD کہتے ہیں۔ تحقیق میں سائنسی طریقے کو رواج دینا مسلم دانشوروں کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ مغربی سائنس دانوں نے اسی اسلامی طریقہ کو اپنا کر سائنس میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔

میرے خیال میں قرآن پاک میں جو تین بنیادی مسائل بیان کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں :

(۱) وحدت (۲) نبوت (۳) قیامت

اب میں یہ بیان کروں گا کہ ان مسائل کو سمجھنے کے لئے جدید سائنس ہماری کیسے مدد کر سکتی ہے۔

۲ : وحدت کا مسئلہ

وحدت کا مسئلہ یعنی ایک خدا کو ماننا اسلام کا سب سے اہم بنیادی عقیدہ ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں بار بار کیا گیا ہے۔ اس مسئلہ کو سمجھانے کے لئے اس پاک کتاب میں ایک بڑی روشن دلیل پیش کی گئی ہے۔ اگر کائنات کو پیدا کرنے والے ایک سے زیادہ خالق ہوتے تو ان کے باہمی جھگڑوں سے کائنات کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ چونکہ کائنات کے وسیع سلسلے میں ہمیں کوئی گڑبڑ نظر نہیں آتی اس لئے اس کا خالق ایک ہی ہے۔

پرانے زمانے میں لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ چاند، سورج، ستارے اور سیارے یعنی تمام فلکی اجسام دیوتے یا خدا ہیں۔ اس خیال کو ثابت کرنے کے لئے دو دلیلیں پیش کی جاتی تھیں۔ پہلی دلیل یہ تھی کہ تمام فلکی اجسام زمین کے گرد دائروں میں حرکت کر رہے ہیں چونکہ جیومیٹری میں دائرہ (CIRCLE) ایک کامل شکل (PERFECT FIGURE) ہے اس لئے یہ کمال صرف کسی دیوتے یا خدا میں ہی پایا جا سکتا ہے۔ دوسری دلیل یہ تھی کہ آسمان کی حالت میں کبھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی جس سے ظاہر ہے کہ تمام فلکی اجسام ایک ایسے کامل عنصر سے بنے ہیں جس میں کبھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس ارضی اجسام میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں پس ارضی اجسام کامل نہیں بلکہ چار گھٹیا عناصر (ELEMENTS) یعنی آگ، پانی، مٹی اور ہوا سے بنے ہیں۔ ارسطو اور بہت سے دیگر نامور یونانی حکیموں نے ان دلائل کی حمایت کی۔

اسکندریہ یونیورسٹی کے مشہور ماہر فلکیات بطلیموس (PTOLEMY) نے ارسطو کی تقلید کرتے ہوئے فلکی اجسام کی حرکت کی توجیہہ کرنے کے لئے دوسری صدی عیسوی میں ایک نظام مرتب کیا جسے بطلیموسی نظام کہتے ہیں۔ اس نظام میں یہ فرض کیا گیا کہ تمام فلکی اجسام زمین کے گرد دائروں میں حرکت کرتے ہیں۔ بطلیموسی نظام بڑا پیچیدہ تھا اس لئے سولھویں صدی عیسوی میں کوپرنیکس (COPERNICUS) نے ایک نیا نظام پیش کیا جس میں فرض کیا گیا کہ زمین اور دیگر سیارے سورج کے گرد حرکت کرتے ہیں۔

کئی سالوں تک بطلیموس اور کوپرنیکس کے حامی ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے کے لئے دلائل پیش کرتے رہے لیکن یہ دلائل فلسفیانہ تھے اور اس لئے یقین کے ساتھ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ بطلیموسی نظام درست ہے یا کوپرنیکی۔ دونوں نظام سیاروں کی حرکت کی تقریباً صحیح توجیہہ کرتے تھے لیکن اس زمانے کے مشاہدات میں اتنی صحت (ACCURACY) نہ تھی کہ قطعی طور پر فیصلہ کیا جا سکتا کہ کون سا نظام بہتر ہے چنانچہ ٹائیکو براہے (TYCHO BRAHE) نے سیاروں کی حرکت کا مناسب آلات سے تقریباً بیس سال تک بغور مشاہدہ کیا۔ یہ مشاہدات پرانے مشاہدات کے مقابلے میں زیادہ صحیح اور قابل اعتماد

تھے چنانچہ ان مشاہدات کی مدد سے یہ فیصلہ کرنا ممکن ہو گیا کہ سیارے زمین کے گرد گردش کرتے ہیں یا سورج کے گرد۔ یہ اہم کام ٹائیکو براہے کی وفات کے بعد اس کے شاگرد کیپلر (KEPLER) نے کیا۔ حیرت کی بات ہے کہ ارسطو، بطلیموس، کوپرنیکس، ٹائیکو براہے اور کیپلر سب اس بات کو مانتے تھے کہ سیارے دائروں (CIRCLES) میں حرکت کرتے ہیں چاہے یہ حرکت زمین کے گرد ہو یا سورج کے گرد۔ لیکن کیپلر نے ٹائیکو براہے کے مشاہدات کی بنا پر ثابت کیا کہ سیارے سورج کے گرد دائروں میں نہیں بلکہ بیضوی مداروں (ELLIPTIC ORBITS) میں حرکت کرتے ہیں پس سائنس نے ثابت کیا کہ فلکی اجسام دائروں میں حرکت نہیں کرتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فلکی اجسام کو خدا یا دیوتے تصور کرنا ایک غلط عقیدہ تھا۔

فلکی اجسام کو خدا یا دیوتے ماننے کے لئے دوسری دلیل یہ پیش کی جاتی تھی کہ یہ ایک ایسے کامل عنصر سے بنے ہیں جس میں کبھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ خدا بھلا کرے امریکی خلا بازوں کا جنہوں نے چاند پر اتر کر اس کی سطح کا مشاہدہ کیا اور ثابت کیا کہ جو گھٹیا عناصر زمین پر پائے جاتے ہیں وہی عناصر چاند میں ہیں چنانچہ جدید سائنس نے فلکی اجسام کو دیوتے ماننے کی دوسری دلیل کو بھی غلط ثابت کر دیا ہے۔ پس جدید سائنس توحید کی پُر زور حمایت کرتی ہے۔

۳: نبوّت کا مسئلہ

نبی کو جو "وحی" ہوتی ہے وہ ایک ایسا علم ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ وحی کی حقیقت قرآن پاک میں یوں بیان کی گئی ہے :-

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۖ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل آیت ۸۵)

جدید سائنس بھی اسی نتیجہ پر پہنچی ہے کہ انسان کا علم بہت ہی قلیل ہے۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے راقم کا مضمون "سائنس کے حدود" (LIMITS OF SCIENCE) "اقبال" (سہ ماہی مجلہ بزم اقبال، جلد ۱۷، اکتوبر ۱۹۶۸ء، شمارہ ۲ صفحہ ۶۷)

۴: قیامت کا مسئلہ

قرآن پاک میں موت کے بعد ایک نئی اور ابدی زندگی کا ذکر بار بار کیا گیا ہے۔ کیا موت کے بعد آدمی دوبارہ زندہ ہوگا؟ یہ بات بظاہر ناممکن معلوم ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے لئے انسان کو

دوبارہ زندہ کرنا ناممکن نہیں۔ دوبارہ زندہ کرنے کی ایک بڑی دلیل سورۃ یٰسین میں بیان کی گئی ہے :

اَوَ لَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۭ بَلٰی ۤ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ۝

کائنات اللہ تعالیٰ کی کاریگری کے بے شمار نمونوں سے بھری ہوئی ہے مثلاً انسان کی پیدائش اور موت، بارش سے مُردہ زمین میں جان ڈالنا اور طرح طرح کے پودے پیدا کرنا، فلکی اجسام کی باقاعدہ حرکت وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام قدرتی مظاہر خدا کی آیات یا نشانیاں ہیں۔ جب ہم سائنس کی مدد سے ان قدرتی مظاہر کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ان پر غور کرتے ہیں تو ہمارے دل میں خدا کی عظمت بڑھ جاتی ہے۔ نیز کائنات کا سلسلہ اتنا وسیع اور پیچیدہ ہے کہ جوں جوں ہمارا مشاہدہ زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے توں توں ہماری حیرت بڑھتی جاتی ہے۔ پس جس پاک ہستی نے کائنات کا یہ شاندار نظام مرتب کیا ہے اس کے لئے انسان کا دوبارہ زندہ کرنا ناممکن نہیں۔

بقیہ 'عرض احوال' صفحہ ۴ سے آگے

اَلرَّحْمٰنُ ۝۱ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝۲ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝۳ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ۝۴

راقم کو تقریر اور "بیان" کی جو بھی کم یا زیادہ اور بڑی یا چھوٹی استعداد خدائے رحمان نے عطا فرمائی ہے اسے امکان بھر اسی تعالیٰ کی کتاب حکیم کے مطالب اور اسرار و حکم کے "بیان" اور اسی تعالیٰ کے دین متین کی طرف دعوت دینے میں صرف کئے جا رہا ہے اب اگر وہ اسے شرف قبول عطا فرما دے تو زہے نصیب ع

"گر قبول افتد زہے عزّ و شرف !"

اس لئے کہ حقیقت یہی ہے کہ ؎

"منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی !
منت شناس از اُو کہ بخدمت گذاشتنت !!"

یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ بقول سوامی تلسی داس ؎

" میرا مجھ میں کچھ نہیں، جو کچھ ہے سو تورے !
تیرا تجھ کو سونپتے کیا لاگت ہے موئے !!"

—— (۲) ——

گزشتہ اشاعت میں ہم نے بعض احباب کے خطوط شائع کئے تھے جن میں منجملہ دوسرے امور کے

بعض سوالات ہمارے "ماضی، حال اور مستقبل" کے بارے میں بھی اٹھائے گئے تھے۔ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ان کے بارے میں ہم آئندہ اشاعت میں مفصل گفتگو کریں گے۔ ہم معذرت خواہ ہیں کہ اس شمارے میں وہ قرض ادا نہیں ہو رہا بلکہ بعض اسباب کی بنا پر "وعدہ فردا" پر ٹالا جا رہا ہے البتہ اس سلسلے کا ایک اہم خط مرقومہ شیخ جمیل الرحمٰن صاحب شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ قارئین 'میثاق' کی اکثریت کے علم میں ہے بھائی جمیل الرحمٰن صاحب جماعت اسلامی کے فعال ارکان میں سے تھے اور جماعت سے ۵۷/۵۸ء کے اختلافِ پالیسی کے المناک حادثے ہی کے سلسلے میں علیحدہ ہوئے تھے —— اور اب راقم الحروف کے ساتھ اسی سابقہ جوش کار اور جذبۂ عمل کے ساتھ تعاون فرما رہے ہیں اور فی الوقت انجمن خدام القرآن کراچی کے معتمد عمومی کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

اسی سلسلے کا ایک مختصر لیکن نہایت قیمتی خط ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کا بھی شامل اشاعت کیا جا رہا ہے اللہ سے دعا ہے کہ وہ راقم کو ڈاکٹر صاحب موصوف کی دلی تمنا کے مصداق ان معاملات میں صحیح سوجھ عطا فرمائے اور نفس اور شیطان کے حملوں سے اپنی پناہ میں لیتے ہوئے آئندہ کے بارے میں صحیح فیصلوں تک پہنچنے کی توفیق دے!

ضمناً یہ اطلاع بھی شاید موضوع سے غیر متعلق نہ ہو کہ راقم نے فیصلہ کیا ہے کہ کچھ دن ان مسائل پر غور و خوض کے لئے بالکل علیحدگی اور تنہائی میں بسر کئے جائیں چنانچہ ماہ جون میں لاہور کے جملہ پروگرام مثلاً درس و خطاب کے معطل کرنے کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ راقم کی خواہش ہے کہ کم و بیش دو ہفتے گوشۂ عزلت میں رہ کر آئندہ کا لائحہ عمل طے کرے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم!

قارئین 'میثاق' سے بھی استدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں راقم کے لئے دست بدعا ہوں ؎

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا اور درویش کی صدا کیا ہے"

—— (۳) ——

ماہ جولائی ۷۲ء کے دوران لاہور میں ایک ماہی تربیتی پروگرام کے انعقاد کا فیصلہ ہوا ہے جس میں ہماری خواہش تو یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ کل وقتی طور پر اقامت گزیں رہیں تاہم پروگرام ایسا رکھا گیا ہے کہ لاہور کے زیادہ سے زیادہ احباب امکانی حد تک استفادہ کر سکیں چنانچہ ایک درس قرآن روزانہ بعد نماز مغرب لاہور کے کسی مرکزی مقام پر ہوگا جس میں راقم مطالعہ قرآن کے اپنے مرتب کردہ منتخب نصاب کا درس دے گا ایک درس حدیث روزانہ صبح بعد نماز فجر ہوگا۔ بعد عصر ایک سبق عربی کے بنیادی قواعد کا رکھا جائے گا اور ان سب پر مستزاد صبح کے اوقات میں باقاعدہ تدریس کی صورت ہوگی۔ بیرون لاہور سے زیادہ سے زیادہ احباب کو اس پروگرام میں شریک ہونا چاہیئے

 اور اپنے ارادہ سے زیادہ سے زیادہ ۲۵ر جون تک ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کو مطلع کر دینا چاہئے

افکار و آراء

سیل خیال

ڈاکٹر عبدالخالق، رحیم یار خاں
ایم بی بی ایس، ڈی سی ایچ

ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کا ابتدائی تعارف قارئین 'میثاق' سے گزشتہ شمارے کے ذریعے ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک فعال سماجی کارکن ہونے کے علاوہ اپنی پیشہ ورانہ تنظیم یعنی پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کی رحیم یار خاں برانچ کے جنرل سیکرٹری بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی برانچ کی سالانہ کارکردگی کی جو رپورٹ بابت ۷۳/۷۴ء ایسوسی ایشن کے اجلاس منعقدہ ۳۰ مارچ ۷۴ء میں پیش کی تھی وہ راقم کو اس ہدایت کے ساتھ ارسال کر دی تھی کہ:

"حسب سابق اس سال بھی پی ایم اے کے سالانہ اجلاس میں اپنے دوستوں کو اپنی پریشان خیالی سے بور کیا تھا، وہ رپورٹ بھیج رہا ہوں، پڑھ کر اسے پی ایم اے پریذیڈنٹ پنجاب کو بھجوا دیں"

راقم نے سوچا کہ کیوں نہ اس 'پریشان خیالی' میں قارئین میثاق کو بھی شامل کر لیا جائے۔

اس کا پہلا حصہ جس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے مخصوص انداز میں قومی و ملی مسائل پر بحث کی ہے چونکہ عام دلچسپی کا ہے لہٰذا من و عن شائع کیا جا رہا ہے۔

دوسرے نمبر پر مذکورہ رپورٹ کے خالص 'کاروباری' حصے سے اقتباسات ہیں ان کے بارے میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ 'میثاق' میں اس کا کیا مقام؟ سو گزارش ہے کہ اوّل تو معالج حضرات بھی ہمارے معاشرے کا ایک اہم جزو ہیں اور ان کے مسائل و معاملات پر خصوصاً جس انداز سے ڈاکٹر صاحب نے کلام کیا ہے، عمومی دلچسپی کی چیز ہونی چاہیئے —— دوسرے یہ بھی ایک اضافی حقیقت ہے کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا ایک خصوصی تعلق ڈاکٹروں کے حلقے سے ہے۔ اوّلاً اس لئے کہ خود راقم بھی ع "گو واں نہیں پہ واں کا نکالا ہوا تو ہے!" اور ثانیاً اس لئے کہ اس کے

موسیقین، محسنین اور مستقل ارکان کی ایک معتدبہ تعداد ڈاکٹروں ہی پر مشتمل ہے۔

ایک خاص بات جس کی جانب ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس تحریر میں توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔ واقعتہً نہایت اہم ہے۔ یعنی یہ کہ ہمارے میڈیکل کالجوں میں دینیات یا اخلاقیات کی تعلیم و تدریس کا سرے سے کوئی انتظام نہیں ہے! یہ یقیناً ایک بہت بڑی غفلت اور عظیم کوتاہی ہے جس کا ازالہ فوری طور پر کیا جانا ضروری ہے —— حیرت کی بات ہے کہ انجینئرنگ یونیورسٹی میں ایک پورا شعبہ اسلامیات موجود ہے حالانکہ انجینئر حضرات کا واسطہ زیادہ تر انسانوں سے نہیں بلکہ اینٹ، پتھر، بجری، سریے یا مشینوں سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان کے کسی بھی میڈیکل کالج میں دینیات کی تعلیم کا کوئی ابتدائی اہتمام بھی نہیں۔ حالانکہ ڈاکٹروں کا تعلق تمام تر انسانوں سے ہوتا ہے اور ان کی دینی و اخلاقی تربیت کی نہایت شدید ضرورت ہے۔ استاذی المکرّم ڈاکٹر الٰہی بخش مرحوم اپنے مخصوص انداز میں کہا کرتے تھے کہ ڈاکٹر کو تو لیبا اوقات" عورات النساءؔ" کے ذیل میں شوہروں سے بھی بڑھ کر رسائی حاصل ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اس مسئلے کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

لہٰذا راقم بھی ڈاکٹر صاحب کی ہمنوائی میں نہایت زوردار الفاظ میں پیشۂ طب سے متعلق تمام حضرات کو بالعموم اور انجمن خدام القرآن سے کسی بھی حیثیت میں منسلک ڈاکٹر حضرات کو بالخصوص اس مسئلے کی جانب متوجہ کرتا ہے کہ وہ اس عظیم کوتاہی کی فوری تلافی کے لئے باقاعدہ کوشاں ہوں —— خاکسار اسرار احمدؐ عفی عنہ"

صدر محترم، مہمانان کرام، رفیقان عزیز!

پی ایم اے رحیم یار خاں آج باہمی روابط کے ایک نئے مرحلے میں داخل ہوتی ہے اس کے لئے میں اپنے معزز مہمانوں کا خاص طور پر ممنون ہوں۔ اس تقریب میں ان کی شرکت نے جس مبارک رسم کا آغاز کیا ہے امید ہے آئندہ وہ ایک مستقل روایت بن جائے گی اور ایسی باقاعدہ ملاقاتیں مشترکہ مسائل کے حل میں مدد دینے کے علاوہ ہماری سوچ کو بتدریج مقامی سطح سے قومی سطح تک لے جانے میں معاون ہوں گی۔

آپ جانتے ہیں کہ قوم کی جسمانی، سماجی اور ذہنی صحت کی تکمیل ہماری ذمہ داری ہے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہم اپنی ملت کی فکری رہنمائی سے غافل نہیں رہ سکتے۔ اس رہنمائی کے لئے ہمیں خود اپنی سوچ کو بے تعصب اور واضح بنانا ہوگا۔

ہمارا موضوع انسان ہے۔ انسانی کردار (HUMAN BEHAVIOR) اور انسانی تاریخ کے صحیح ادراک کے بغیر ہم ایک حد تک انسان کی جسمانی صحت کے نگہبان تو بن سکتے ہیں لیکن ذہنی اور سماجی صحت کے

خواب کو حقیقت میں نہیں بدل سکتے۔

بدقسمتی سے انسانی فطرت اور تاریخ کے علوم نے طبیعی علوم (PHYSICAL SCIENCES) کے ساتھ ساتھ سائنسی بنیادوں پر ترقی نہیں کی۔ طبیعی علوم کی محیرالعقول ایجادات اور دریافتوں نے ذہین آدمیوں کو اپنی طرف کھینچ لیا اور یہ علوم اتنے قدآور ہو گئے کہ سماجی علوم (SOCIAL SCIENCES) ان کے مقابلے میں بونے نظر آنے لگے۔ شاید اسی لئے مشہور مفکر "میکڈوگل" نے کہا تھا:

"اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو اپنی تمام تر قوت اور ذرائع سے یہ کوشش کرتا کہ اپنے عہد کے عظیم ترین دانشوروں کو طبیعی علوم سے نکال کر سماجی علوم کی تحقیق میں لگا دوں"

پھر اس دور کے سب سے انقلابی نظریے یعنی نظریہ ارتقائے انسانی (THEORY OF EVOLUTION) نے فکری بنیادوں کو زیر و زبر کر دیا۔ طبیعی علوم کے ساتھ ساتھ سماجی علوم نے بھی نہایت سعادت مندی سے اس نظریے کے آگے سر جھکا دیا۔ ارتقائی نظریہ جمادات نباتات اور حیوانات کی تعبیر کے علاوہ انسانی تاریخ، فلسفہ نفسیات، سیاسیات، اقتصادیات اور مذہب کی بنیاد بن گیا۔ یہاں تک کہ نامور مفکر کارل مارکس نے اسی بنیاد پر جدلیاتی فلسفے کی ایک عظیم الشان اور پرکشش عمارت تعمیر کر لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سماجی علوم بھی مستعار سے اپنے بونے قد پر خول پہ خول چڑھا کر خود کو دیوہیکل بنانے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔

محترم دوستو! سائنس ایک غیر متعصب علم ہے۔ یہ اپنے مشاہدات کو تجربات سے بار بار پرکھ کر ایک نظریہ قائم کرتا اور پھر اس نظریے کی تصدیق مسلسل تجربات اور شواہد سے کرتا چلا جاتا ہے۔ سائنسی طریقے کبھی جزو ایمان نہیں بنتے بلکہ مسلسل تحقیق اور تجربات کی روشنی میں بدلتے رہتے ہیں اس مملکت میں شخصیات کا نہیں دلائل و براہین اور حقائق کا سکہ چلتا ہے۔

لیکن کس قدر ستم ظریفی ہے کہ نظریۂ ارتقا جس کی تائید میں نہ تو مشاہدات کا کافی ثبوت موجود ہے نہ ہی اسے تجربے سے پرکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی زندہ اشیا نے اس عمل کے جاری رہنے کی شہادت فراہم کی ہے۔ بلکہ اس کے خلاف بھی خاصے وزنی دلائل موجود ہیں۔ وہی نظریہ انسانی علوم کی محکم ترین بنیاد بن گیا ہے اور ؎

"خشت اوّل چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج"

مانا کہ یہ نظریہ ڈارون کی پرعزم مہمات اور بے مثال ذہانت کا شاہکار ہے اس نظریے سے انسانی دماغ کی بہت سی گتھیاں سلجھتی ہیں۔ چلئے یہ بھی مان لیا کہ نظریہ ارتقا بھی تفسیر کائنات کی ایک قرین قیاس صورت ہے۔ لیکن اس کی محدود وضاحتوں کو تخیل کی پرواز سے لامحدود بنا لینا سائنس جیسے حقیقت پسند علم کے شایان شان تو نہیں ہو سکتا اور انسان کی آزاد اور متلاشی حق فطرت سے یہ کیسا سنگین مذاق ہے کہ کائنات کی ہر شے کی تشریح صرف اور صرف نظریہ ارتقا کی بنیاد پر صحیح قرار دی جائے اور معاشرے کے تمام قابل ذکر وسائل کام میں لا کر اس نظریے کو حقیقت ثابتہ کی حیثیت سے انسانی علوم کے ہر پہلو میں اس طرح سمو دیا جائے کہ آدمی کو اس کے خلاف

سوچنا بھی حماقت معلوم ہو۔ طالب علم اپنی سوچ کو اسی ایک محور کے گرد گھماتا ہے اور اس کی اس "گردش" کو سائنسی فکر کا نام دے دیا جائے ع "بر عکس نہند نام زنگی کافور!"

دوستانِ محترم! دورِ حاضر کا فکر کا انتشار ایک مربوط اور منظم فکری تحریک کا تقاضا کرتا ہے۔ سائنس کے طالب علموں کو بے خوفی اور بے تعصبی سے فکرِ حاضر کی ٹیڑھی بنیاد یعنی نظریہ ارتقا کا جائزہ لینا لازم ہے۔ عجب نہیں کہ اس کی حقیقت کی تلاش ہمیں ایسے مقام تک پہنچا دے جہاں ہر متلاشئ حق پکار اٹھے "ارے یہ نظریہ تو پوری سچائی کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے"۔

سامعین کرام! یوں لگتا ہے کہ پہلے آدمی مٹی کے بت تراش کر ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتا تھا اور اب خیالی دیوتا بنا کر ان کے سامنے جبیں فرسا ہے ؎

"بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات"

کہیں ایسا تو نہیں کہ انسانی تہذیب و تمدن (تاریخ) ارتقا کے بجائے دائروں کی شکل میں سفر کر رہا ہو۔ کبھی انسانی معاشرے کا فکر و عمل خدا کی ذات سے وابستہ ہو کبھی اس سے گریزاں ہو کر غیر خدا ذات و تصورات میں الجھ کر رہ جائے اور ہماری ظاہر بیں نگاہیں انسان کی جبینِ نیاز کے بدلتے ہوئے آستانوں کو ہی توجہ کا مرکز بنا کر تاریخ انسانی کی تعبیر شروع کر دیں۔

برادرانِ گرامی! سوچئے تو ذہنی غلامی بھی شرفِ انسانی کے ویسے ہی منافی ہے جیسے جسمانی غلامی لیکن یا مظہر العجائب ایک تو قابلِ ملامت اور قابلِ نفرت اور دوسری اس قدر پسندیدہ کہ اس کے فروغ میں معاشرے کے تمام وسائل مصروف۔ اور موجودہ دور کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ بے پناہ پراپیگنڈا اسے دماغوں کو مسحور یا مفلوج کرنے کی مہم علاقائی نہیں بلکہ عالمگیر بنائی جا سکتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

صدرِ محترم! فلسفہ تاریخ کے ایک مفکر سے کسی نے پوچھا کہ قوموں کی بربادی کا سبب کیا ہے؟ جواب ملا ذہنی غلامی اور مفاد پرستی۔ ذہنی غلامی سے انسان کا اعتماد اپنے آپ پر سے اٹھ جاتا ہے۔ اپنے تحفظ کے لئے وہ دوسروں کا محتاج بن جاتا ہے۔ عدمِ تحفظ کا احساس اور دوسروں کی محتاجی اسے مفاد پرست بنا دیتی ہے۔ وہ اپنے فائدے کی خاطر ضمیر، اخلاق اور ایمان کو دور پھینک دیتا ہے۔ ایسے انسانوں پر مشتمل قوم ہر اس طالع آزما کی طرف لپکتی ہے جو اسے فائدوں کی بشارت دے رہا ہو۔ اس میں بصارت تو ہوتی ہے لیکن اس بصیرت سے جو افراد اور معاملات کے ظاہر و باطن میں تمیز کر سکے محروم ہونے کے باعث سیاہ پتھر کو بھی انگوٹھی سمجھ لیتی ہے۔ مولانا رومی کے نزدیک امتیں اسی آزار سے مر جاتی ہیں ؎

"ہر ہلاکِ امتِ پیشیں کہ بود زانکہ بر جندل گماں بردند عود"

رفیقانِ محترم! میں سمجھتا ہوں قوم کو ذہنی غلامی سے نکال کر اس کا اپنے آپ پہ اعتماد بحال کرنا اس قوم کے

دانشوروں کا اوّلین فریضہ ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہم ملّت کی فکری رہنمائی کے مکلّف ہیں۔ اس کام کے لئے ہمیں سب سے پہلے اپنے آپ کو ذہنی غلامی سے آزاد کرنا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ ابھی پوری طرح جسمانی لحاظ سے بھی آزاد نہیں ہوئے۔ پہلے غیروں کے محکوم تھے اب اپنوں کے محکوم ہیں اور ذہنی طور پر تو کیا حاکم کیا محکوم غیروں کے افکار و نظریات کے بالعموم بندۂ بے دام ہیں۔ جب یہ عالم ہو تو ؎

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو آنکھ جن کی ہوئی محرومی و تقلید سے کور!"

لطف کی بات یہ ہے کہ ہم خود تو "فکر و تدبّر کے سلیقے" یا "جدّتِ فکر" اور "جدّتِ گفتار" سے محروم ہیں لیکن دوسروں کے افکار و نظریات کی اندھی پیروی کو ہم نے آزادیٔ فکر کا نام دے رکھا ہے جبکہ ؎

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی رکھتے نہیں جو فکر و تدبّر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

اور عصرِ حاضر میں فکر کی پختگی کی تلاش!

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

اور اب تو لادینی افکار کی یلغار نے مشرق میں بھی عشق کو مضمحل کر دیا ہے۔ سوچئے تو علم کا صرف ایک پیمانہ ہوتا ہے اس کا عمق یعنی گہرائی۔ عمیق مطالعے اور دقیق مشاہدے سے ہی مسائل کی تہ میں اتر جانے کی صلاحیت نشو و نما پاتی ہے۔ میرے خیال میں سائنس کے طالب علم کے لئے ذہنی غلامی کی زنجیریں کاٹ پھینکنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اسی لئے میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ اپنی جزئیات شناس اور حقیقت رس نگاہوں کو قومی امراض کی تشخیص اور امراض میں بھی صرف کیجئے۔

میں آپ کو آج کی عملی سیاست میں آنے کا مشورہ نہیں دیتا ؎

"خدا محفوظ رکھے عہدِ حاضر کی سیاست سے نہیں اس کھیل سے باہر جہاں کا مکر و فن کوئی"

بلکہ تدبّر اور تفکّر کے میدان میں ان راہوں پر چلنے کی دعوت دے رہا ہوں جہاں آدمی لوگوں کی تحسین و تفریق اور ساتھیوں کی تعداد سے یکسر بے نیاز ہو کر صرف اپنی بصیرت اور ضمیر کی رہنمائی میں قدم بڑھاتا ہے۔

دوستانِ عزیز! میں آپ کے صبر کا مزید امتحان نہیں لوں گا۔ پی ایم اے کے اجلاس میں ایسی گفتگو غیر معمولی معلوم ہوتی ہے لیکن غیر معمولی حالات غیر معمولی سوچ کا تقاضا کرتے ہیں۔ مجھے اپنی کم علمی کا احساس بھی ہے اور اپنے منصب کا پاس بھی، لیکن جب میں نے ایسوسی ایشن کی رپورٹ لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو دل نے آواز دی "سن! تیری ملّت کے مسائل تیرے پیشے کے مسائل سے زیادہ قابلِ توجہ ہیں اور میری غیرت نے یہ

گوارا نہ کیا کہ قومی افق پہ نگاہ ڈالے بغیر گزر جاؤں اور میرے دل کے زخموں سے پیہم یہ صدا آتی رہے۔

"خود اپنی آگ میں جلتی ہے شمع جلنے دو — پرائی آگ میں جلنا ہے کارِ مردانہ!"

صدرِ مکرم!

اب اگر اجازت ہو تو بارے کچھ اپنا بیان بھی ہو جائے۔

ہماری ایسوسی ایشن ایک عام سی انجمن ہے۔ اپنی زندگی کے تین سالوں میں اس نے کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا اور اگر کوئی بات قابلِ ذکر ہے بھی تو اس کے پریذیڈنٹ اور سیکرٹری کی افتادِ طبع کے باعث اس کی شہرت نہیں ہوئی۔ ہر چند ہمارے صدر سیکرٹری کو پبلسٹی کے فوائد سے آگاہ کرتے رہتے ہیں لیکن بالعموم تجاویز گفتگو سے آگے نہیں بڑھتیں اور چونکہ اصولی طور پہ دونوں ہم مسلک ہیں اس لئے سب کام بلا تشہیر ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ہمارے ساتھیوں نے شہرت کی سائنس کے اس ترقی پسند زمانے میں ان رجعت پسندوں کو بدلنے کی تدبیر نہ کی تو مجھے اندیشہ ہے ان کی سربراہی میں ہماری ایسوسی ایشن کے کام اسی شعر کے مصداق رہیں گے۔

"ہم سا کوئی گمنام زمانے میں نہ ہوگا
گم ہو وہ نگیں جس پہ کھدے نام ہمارا"

ارکان سازی کا مسئلہ ہم نے مستقل طور پہ حل کر لیا ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اس ضلع کا ہر ڈاکٹر (وہ سروس میں ہو یا پریکٹس میں) جس طرح یہاں کی آب و ہوا سے بہرہ ور ہونے کا حق رکھتا ہے اسی طرح وہ اس بات کا حقدار ہے کہ وہ ہماری ایسوسی ایشن کا ممبر بن جائے۔

ممبرشپ فیس کے لئے ہمیں خاص تگ و دو نہیں کرنا پڑتی۔ الیکشن کے روز اکثر حاضر ممبران ۲۰ روپے سالانہ چندہ دے دیتے ہیں اس رقم سے ہم چار روپے فی کس صوبائی اور مرکزی حصہ بھیج دیتے ہیں۔ غیر حاضر ممبروں کی اکثریت بھی سال بھر میں اپنا چندہ ادا کر دیتی ہے اقلیت کو ہم اپنے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔

ہماری ماہانہ میٹنگ میں حاضری کا مسئلہ ڈاکٹر معین صدیقی کی تجویز نے حل کر دیا ہے۔ اب باقاعدہ اجلاس باری باری ارکان کے گھروں پر ہوتے ہیں اور بے قاعدہ یعنی ہنگامی جلسوں کے لئے ہمارے پریذیڈنٹ نے دعوت عام دے رکھی ہے ع

غریب خانہ حاضر ہے ہر بلا کے لئے

ڈاکٹر طالب حسین کہتے ہیں تمہاری میٹنگ میں کون آتا ہے۔ ہم تو ڈنر کھانے آیا کرتے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ڈنر کے بہانے ہی اس ضلع کے ڈاکٹر ایک دوسرے کے قریب آتے جا رہے ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو انجمن سازی کا بنیادی مقصد بھی تو یہی ہوا کرتا ہے۔

البتہ ڈاکٹر معین صدیقی کی نئی تجویز نے مجھے کچھ الجھن میں ڈال دیا ہے وہ کہتے ہیں ڈنر میٹنگ ہر روز ان

کے گھر پہ ہوا کرے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اپریل کی میٹنگ ڈاکٹر اختر کے گھر پہ ہو۔ میں ان کی شرط منظور کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ ہماری آئندہ میٹنگ ڈاکٹر اختر کے ہاں ہوگی۔ روزانہ یا ماہانہ ڈنر کا فیصلہ میں ممبران اور ڈاکٹر معین صدیقی پہ چھوڑتا ہوں۔

صاحب صدر اور معزز مہمانو! ہماری ایسوسی ایشن کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ حساب کتاب کے معاملے میں ہم نے برصغیر کے مسلمانوں کی عظیم روایت کی حرف بحرف پیروی کی ہے۔ یہ مسلمان دنیا میں بلا حساب جیتا ہے اور اس جینے میں کراماً کاتبین کو بھی غچّہ دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

"کچھ سمجھ میں جو آتا تو فرشتے لکھتے صاف ہیں نامۂ اعمال سیاہ کاغذوں کے!"

اور آخرت میں بلا حساب مغفرت تو ہمارے ایمان کا جزوِ اعظم ہے۔

"رند بخشے گئے قیامت میں شیخ کہتا رہا حساب حساب!"

حضرات گرامی!

وقت کی کمی کے پیشِ نظر میں ملک میں کوالٹی کنٹرولوں کی عملی طور پہ غیر موجودگی میں بازار میں غیر معیاری ادویہ کے سیلاب، عطائیت کے انسداد، پرائیویٹ پریکٹشنرز کی مسلسل تعلیم و تربیت ان کے لئے فیس مشورہ اور تعطیل کی روایت اور دوسرے مسائل سے صرفِ نظر کرتا ہوں۔

لیکن یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ پی ایم اے کے ذمہ ڈاکٹروں کے حقوق کے تحفظ کے ساتھ ان کے اخلاقی تحفظ کا کام بھی ہے۔ اگر اخلاقی تربیت کا انتظام مستقل بنیادوں پر نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ مادہ پرستی اور لطف کوشی کے اس دور میں آہستہ آہستہ سفید بھیڑیں اپنے اوپر اتنی سیاہی مل لیں گی کہ کالی بھیڑوں کی پہچان مشکل ہو جائے گی۔

میرے خیال میں ہر میڈیکل کالج میں اخلاقیات کی تعلیم و تربیت کا مستقل شعبہ ہونا چاہیئے اور اس کا سربراہ پروفیسر کے درجے کا آدمی ہو۔

ہمارے پیشہ ورانہ فرائض اور عزت نفس کا احساس ہم سے کم از کم طبیّ اخلاق CODE OF MEDICAL ETHICS کی پابندی کا تقاضا کرتے ہیں۔ ابھی تک پاکستان میڈیکل کونسل کے دفتر سے ہمیں اس CODE کی کاپیاں موصول نہیں ہوئیں جوں ہی وصول ہوگئیں انہیں ارکان تک پہنچا دیا جائے گا۔

جب ارکان ضابطۂ اخلاق سے باخبر ہو گئے تو ایک ETHICS SUBCOMMITTEE کی تشکیل کی جا سکتی ہے تاکہ یہ ضابطۂ اخلاق کے عملی نفاذ اور ترویج کے لئے مستقل بنیادوں پہ کام کرے۔

آخر میں ایک بار پھر میں اپنے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہمیں توقع ہے کہ آپ ہماری ان کوتاہیوں سے درگزر فرمائیں گے جو آپ کے آرام و آسائش کے سلسلے میں ہم سے ہو سکتی ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ "اب ملاقات ہوئی ہے تو ملاقات رہے گی!" فقط!!

(۲)

بدھ ۸ر مئی ۱۹۷۶ء بوقت شب

برادر گرامی! السلام علیکم۔ مئی کے میثاق میں اپنا خط پڑھ کر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی، حیرت اس لئے کہ میرے خیال میں میثاق کے لئے اس کی اہمیت نہ تھی۔ افسوس اس وجہ سے کہ مجھے اپنی شہرت سے کچھ وحشت سی ہوتی ہے۔ اگر مجھے گمنامی اور شہرت میں سے ایک چیز پسند کرنے کو کہا جائے تو میں فوراً گمنامی کو چن لوں گا اگر مجھے اس خط کے چھپنے کا خیال ہوتا تو آپ سے کہہ دیتا کہ میرا نام درج نہ کریں۔

زبیر صاحب نے آپ کی دعوت سے متعلق جو سوال اٹھائے ہیں وہ یہاں کے احباب کے ذہنوں میں بھی ہیں۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر نور الٰہی صاحب نے اس سلسلے میں مجھ سے طویل گفتگو کی تھی۔ ان سوالوں کا جواب ایک نہایت اہم دستاویز ہوگی۔ اسے اس قدر واضح، مدلل اور دلکش ہونا چاہیئے کہ متلاشیانِ حق کے دل و دماغ کو متاثر اور مطمئن کر سکے۔ یہ تحریر آپ کی تحریک کو ان گنت مخلص کارکن بھی مہیا کر سکتی ہے اور یہی تحریر آپ کے موجودہ سوچنے والے ساتھیوں کو بھی تذبذب میں ڈال سکتی ہے۔ اس پر خوب غور و فکر سے کام لیجئے اور اس کی تیاری میں اپنی اعلیٰ ترین دماغی صلاحیتوں کے علاوہ آہِ سحر گاہی سے بھی کام لیجئے۔ ہر مفکر اپنے مقصد کے عشق سے سرشار ہوتا ہے اور عملی میدان میں اس کی کامیابی کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے دل و دماغ کو مسخر کر کے یہی عشق ان کے رگ و پے میں دوڑا دے۔

ارشد علوی صاحب کے خط پر تبصرہ بے سود سمجھتا ہوں۔ آپ کے جواب نے البتہ اگر تحریک کی۔ تو ضمناً اس کا تذکرہ بھی ہو جائے گا۔ فقط۔

عبدالخالق، از رحیم یار خاں

انجمن خدام القرآن کراچی کی اوّلین پیشکش

نبی اکرمؐ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک اہم تقریر

قیمت ۷۵ پیسے۔ تبلیغی مقاصد کے لئے پچاس روپے سینکڑہ

انجمن خدام القرآن کراچی

۲۴۔ جاپان مینشن ۲ پریڈی اسٹریٹ صدر، کراچی ۳

(مرکزی انجمن سے بھی منگائی جا سکتی ہے)

افکار و آراء

دینی تحریکوں کے باہمی اختلافات

شیخ جمیل الرحمان بھولا والے۔ کراچی

مکرمی و محترمی، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

ماہ مئی کا میثاق نظر نواز ہوا، "بریدِ حرم" اور "یہ بھی اک رُخ ہے" ان دونوں مراسلوں کے مطالعہ سے کچھ لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ چنانچہ یہ مراسلہ ارسال خدمت ہے، پسند آئے تو میثاق میں اسے بھی جگہ دی جاسکتی ہے۔ اس نوع کے مراسلات جیسے مئی کے شمارے میں شائع ہوئے ہیں، میری دانست میں قارئین میثاق کی نہ صرف دلچسپی کا باعث ہوں گے بلکہ انشاء اللہ تطہیرِ افکار کے لئے سودمند اور مفید ثابت ہوں گے۔

اس وقت پاکستان میں کئی دینی تحریکیں چل رہی ہیں جن میں "جماعت اسلامی" اور تبلیغی جماعت کی تحریکیں قبول عام کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مزید برآں آپ کی تحریک "دعوت رجوع الی القرآن" اور ڈاکٹر مسعود الدین حسن عثمانی کی تحریک توحید اور تحریک ابطال و ردِّ شرک و بدعت (حزب اللہ) بھی دو اہم تحریکیں ہیں گو ابھی ان کا حلقہ نفوذ و اثر متذکرہ بالا دو تحریکوں کے مقابلہ میں انتہائی محدود ہے۔

موجودہ دور میں معاشرہ کا پھیلاؤ اور انسانی زندگی کے گوناگوں مسائل اور پیچیدگیاں، نیز بگاڑ کی کیفیت و کمیت دونوں لحاظ سے، موجودہ ہمہ گیری اس امر کی متقاضی ہیں کہ معاشرہ کے بناؤ اور اصلاح کے لئے دو چار نہیں بلکہ بیسیوں اور سینکڑوں کی تعداد میں اصلاحی تحریکیں برپا ہوں۔ مجھے آپ کی اس رائے سے صد فی صد اتفاق ہے جس کا اظہار آپ اپنے ایک خطاب میں کر چکے ہیں کہ موجودہ دور میں کسی ایک سماجی برائی (SOCIAL EVIL) کے مٹانے کے لئے اگر چند لوگ اجتماعی طور پر کوئی تحریک چلائیں تو خواہ وہ کتنا ہی جزوی کام نظر آئے بہرحال وہ مفید ہوگا اور ایسی تمام اصلاحی تحریکوں کے نتائج جب ایک جگہ POOL ہوں گے تو بڑے ہمہ گیر اور گھمبیر ثابت ہوں گے لہذا انسداد رشوت، امتناع شراب و قمار، شادی بیاہ کی لغو و مہلک رسوم سیئہ کی اصلاح کی تحریکیں اور اسی نوع کی دوسری تحریکیں کسی حال میں بھی مضر نہیں ہوسکتیں بلکہ مفید مطلب ہی ہوسکتی ہیں۔ میری رائے میں بھی اصلاح معاشرہ

کے لئے اگر ایسی بے شمار تحریکیں اٹھیں اور ان کو چلانے والے مخلص بھی ہوں تو شاید اصلاح حال کے لئے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں امید کی کوئی کرن نظر آئے۔ ورنہ صورت حال تو یہ ہے کہ دینی و اخلاقی بگاڑ اور انحطاط اور فحاشی و بے حیائی کے موجودہ سیلاب کو روکنا بظاہر ممکن نظر نہیں آتا اور ان دینی تحریکوں کے جن کا ملک میں شہرہ ہے، عمل اصلاح کی حیثیت اس سے زیادہ نظر نہیں آتی۔ جیسے کوئی تیز و تند سیلاب کے آگے کچی مٹی کے گارے سے بند باندھنے کی کوشش کرے۔

میرے اس خیال کی تائید کے لئے ثبوت ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتائج ہیں اور بعدہٗ سقوط مشرقی پاکستان کا المیہ اور بنگلہ دیش کا وجود ہے۔ اگر دینی تحریکوں کی کوئی مضبوط گرفت ہمارے معاشرہ پر ہوتی تو یہ ہولناک نتائج کبھی بھی رونما نہ ہوتے۔ مشرقی پاکستان کا المیہ تو نہ صرف اسلامی تاریخ بلکہ انسانی تاریخ میں ایک منفرد مقام عبرت کا حامل ہے۔ ایک ہی خطۂ زمین میں ایک ہی دین و مذہب کے ماننے والوں کے ہاتھوں صرف زبان اور علاقہ کی تمیز و امتیاز کے باعث جو کشت و خون ہوا ہے، عصمتوں اور آبروؤں کے جو آب گینے چکنا چور ہوتے ہیں پھول سے جو معصوم بچے پیروں تلے کچلے گئے ہیں، غرض کہ غارتگری، وحشت اور بربریت و بہیمیت کا جو ہولناک مظاہرہ ہوا ہے ایسا ہولناک نظارہ اس نیلے آسمان نے شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ پھر ایک ہی ملک کی فوج نے قیام امن کے نام پر اپنے ہی ہم وطنوں کے ساتھ جو چیرہ دستیاں کیں، جو طرز جور و جفا روا رکھا اس کی مثال بھی شاید ہی تاریخ میں مل سکے۔ ستم بالائے ستم ایک ملک کی نوے ہزار فوج کا ہتھیار ڈال کر دشمن کی اسیری میں چلے جانا بھی جنگ و جدال کی تاریخ کا ایک انوکھا سانحہ ہے۔ میرے خیال میں اس کی نظیر بھی تاریخ میں شاید ہی مل سکے گی۔

یہ سانحہ اس امر کا مقتضی ہے کہ پوری سنجیدگی اور دل سوزی سے ان اسباب و عوامل کا کھوج نکالا جائے جن سے یہ نتائج برآمد ہوئے اور پھر اصلاح اور علاج کے لئے مؤثر تدابیر اختیار کی جائیں لیکن افسوس تا حال ایسی کوئی کوشش کم از کم مجھے نظر نہیں آتی۔ اس سانحہ کو (POLITICAL EXPLOITATION) کے لئے استعمال کرنے سے زیادہ کسی نے وقعت ہی نہیں دی ہے۔ سیاسی بے تدبیری اور ہوس اقتدار کی جنگ ہی کو اس کا اصل سبب سمجھ لیا گیا ہے اور بس اور اسی کا پرچار بھی ہو رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ دو اسباب بھی اس سانحہ کے رونما ہونے میں بڑے مؤثر تھے لیکن یہ ہی اصل اسباب نہیں ہیں بلکہ اصل و حقیقی سبب دوسرا ہی ہے اور وہ ہے ہمارے معاشرہ میں "ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت" کا مضمحل ہو جانا۔ محاسبہ اخروی سے بے پروا ہو جانا (اس موضوع پر اگر توفیق ایزدی ہوئی تو انشاء اللہ مستقبل قریب میں کچھ لکھنے کی کوشش کروں گا، اس موقع پر اشارہ ہی کافی ہے) دوسرا اہم سبب دینی جماعتوں کا اختلاف ہے جس کے باعث ان جماعتوں کی معاشرہ پر کوئی مضبوط گرفت نہیں ہے۔ آج کے مراسلہ کا اصل موضوع یہی ہے اس لئے گفتگو اسی پہلو سے ہوگی۔

اس مراسلہ میں جن دینی تحریکوں کا نام کے ساتھ حوالہ دیا گیا ہے یہ تحریکیں اور دوسری دینی تحریکیں اس بات کی مدعی ہیں کہ ان کی دعوت اسلام کی دعوت ہے، دین کی دعوت ہے اور ان کا "طریق کار" بھی خالص اسلامی اور

دینی طریق کار ہے ——— ایک عام شخص جب ایک طرف ان دعاوی کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف ان دینی جماعتوں کے طریق کار کے صریح و واضح اختلاف کو دیکھتا ہے ان کے APPROACH کے فرق کو دیکھتا ہے تو وہ حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ یہ اختلاف، یہ افتراق، یہ بُعد، ایسا اختلاف، فرق اور بُعد نہیں ہے جو چھپا رہ سکے، بلکہ ایک عام فہم و ادراک کا حامل شخص بھی اس کو بہ یک نظر محسوس کر لیتا ہے۔ فطین و ذہین طبقہ کا تو کہنا ہی کیا، نصب العین کا اختلاف اور پھر تعبیر کا اختلاف بھی اگرچہ اپنی جگہ موجود ہے لیکن وہ نمایاں نہیں، اس کو معلوم کرنے کے لئے بڑی گہرائی میں اُترنا پڑتا ہے جو ظاہر ہے کہ ہر کس و ناکس کے بس کا کام نہیں۔ بات جب تک اصطلاحات تک محدود رہتی ہے تو بالکل ایک ہی معلوم ہوتی ہے۔ "احیائے دین"، "اسلام کی نشاۃ ثانیہ"، "اقامت دین" "غلبہ دین"، "اظہار دین"، "اسلامی نظام"، "حکومت الٰہیہ"، "شہادت حق" اور "دعوت توحید" اپنے مفہوم، معنی اور مطلب کے لحاظ سے مترادفات ہی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہر اصطلاح کے پیچھے ایک مدلل نقطہ نظر اور فکر موجود ہے جس میں تفاوت موجود ہے کسی پر دین کے سیاسی پہلو کا غلبہ ہے لہٰذا ان کے ہاں دین کی تعبیر میں یہ فکر اتنا غالب ہو جاتا ہے کہ انہیں پورا دین اور اس کے تمام اوامر و نواہی، اس کے مقرر کردہ فرائض صرف اسی سیاسی محور کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ کسی کے نزدیک فرض عبادات (روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ) ہی اصل دین ٹھہرتے ہیں، سیاسی غلبہ طاغوتی طاقتوں کے ہاتھوں سے زمام کار چھیننا اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین کو نظام زندگی کی حیثیت سے بالفعل نافذ کرنے کی جدوجہد کرنا ان کے دائرہ عمل سے باہر کی چیز ہے۔

طریق کار کے اختلاف کا جو سبب میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ قرآن و حدیث میں احیائے دین کے لئے بطور "نص" کوئی ایک واضح طریق کار موجود نہیں البتہ طریق کار کی رہنمائی کے لئے بہت سے اشارات ملتے ہیں لہٰذا ہر دینی تحریک، دینی جماعت اور ادارہ نے اپنے لئے جو طریق کار بھی منتخب کیا ہے اس کو اس تحریک، جماعت اور ادارہ کے اکابر کا استنباط اور استخراج ہی کہا جا سکتا ہے۔ کتاب و سنت میں ایک واضح اور بطور "نص" کسی طریق کار کا موجود نہ ہونا میرے ناقص خیال میں اس امر کی دلیل ہو سکتا ہے کہ حالات و احوال کے لحاظ اور مناسبت سے طریق کار کے استنباط کی دین میں گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ علمائے حق مکانی و زمانی حالات و احوال کے تقاضوں کے مطابق ایسا طریق کار اختیار کر سکیں جو دین کے مجموعی مزاج اور سنت کے مطابق ہو۔

اگر کسی ادنیٰ درجہ میں بھی میری اس رائے سے اتفاق ہو تو طریق کار کا اختلاف عرف افضل و مفضول اور راجح و مرجوح کا رہ جاتا ہے جیسے بہت سے فقہی مکاتیب فکر میں بعض سنن پر عمل کا معاملہ ہے اور بعض استنباطی مسائل میں نقطہ نظر کے اختلاف کا معاملہ ہے۔

لیکن اس امت مسلمہ کی بدقسمتی ہے کہ فقہی مسالک اور تعبیر میں نقطہ نظر کے اختلاف نے جہاں امت میں گروہ در گروہ تفریق کر دی اور معاملہ افضلیت کی حدود سے تجاوز کر کے صحیح و غلط پر منتج ہوا، استنباطی مسائل کو فروع کا مقام دینے کے بجائے "اصل" قرار دے دیا گیا اور اس کسوٹی پر "ایمان" تک کو پرکھا جانے لگا وہاں موجودہ دور

میں خادمان دین کے استنباطی طریق کار کے اختلاف نے بھی یہ مقام حاصل کر لیا ہے کہ جماعتی غلو، تحزب، تعصب اور عصبیت میں اکابر سے لے کر اصاغر سب ہی مبتلا نظر آتے ہیں۔ ہر جماعت و تحریک صرف اپنے اختیار کردہ طریق کار ہی کو صحیح قرار دینے اور دوسرے طریقوں کی نفی اور تنقیص کرنے پر مصر نظر آتی ہے اور ان کو غلط قرار دیتی ہے جس کے سبب سے ان تحریکوں کے کارکنان میں باہمی کش مکش اور تصادم ہونے لگتا ہے۔

جب فقہی مسالک کے استنباطی اور تعبیری مسائل کو ان کی جائز حدود یعنی افضل و مفضول اور راجح و مرجوح سے متجاوز کیا گیا اور ان کو جائز و ناجائز اور حق و ناحق کا معیار اور مرتبہ دے دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دین کی حقیقی اور اساسی تعلیم اس کا بنیادی فلسفہ و حکمت، اس کی اصل غایت و مقصد نظروں سے بالکل اوجھل ہوتا چلا گیا اور امت کے خواص و عوام (الا ماشاء اللہ) کا دائرہ، ان فقہی اور فروعی اختلافات کو ہوا دینا، ان کو نمایاں کرنا، ان پر مناظروں کا بازار گرم کرنا ان پر حق و غیر حق کے فتاوی دینا ہو گیا اور یہی خدمت دین ٹھہری۔ اب توحید، جنت دوزخ، حشر و نشر، حساب و کتاب کے احوال پر وعظ آپ کو کم سننے میں آئیں گے۔ تعمیر سیرت و کردار کی تعلیم اور معاملات و اخلاق کی اصلاح کے لئے پند و نصائح شاذ ہی سننے میں ملیں گے البتہ ان فقہی اور فروعی مسائل پر دھواں دھار تقاریر ہر منبر و محراب سے خوب سننے کو ملیں گی الا ماشاء اللہ۔ آج ہمارے علماء کرام کی عظیم اکثریت اسی مشغلہ میں مصروف نظر آئے گی۔ ان کے نزدیک فاتحہ خلف امام، رفع یدین، ترک رفع یدین، آمین بالجہر و بالسر، موزوں پر مسح، عیدین کی تکبیریں، نماز تراویح کے لئے رکعات کی تعداد ہی خالص دینی مسائل ہیں۔ گویا ان ہی کے صحیح اور غلط پر آخرت کی نجات کا انحصار ہے۔ یہ بڑی تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں الا ماشاء اللہ جو شعبہ تبلیغ قائم ہوتا ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ ایسے مبلغ تیار کئے جائیں جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کو بندگی رب کی دعوت دیں، وعظ کے ذریعہ لوگوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کریں، جاہلیت قدیمہ و جدیدہ سے لوگوں کو آگاہ کریں، موجودہ دور کے مادہ پرستانہ شرک سے لوگوں کو واقف کرائیں، اس خدا ناآشنا معاشرہ میں معرفت کردگار اور خوف آخرت پیدا کریں، ان میں وہ قوت تمیز پیدا کریں کہ ان کی فکر و نظر خالص مومنانہ ہو جائے۔ ان میں جہاد فی سبیل اللہ کا جوش و ولولہ پیدا کریں، ان میں دین کی حمیت پیدا کریں اور باطل سے نفرت کو نشو و نما دیں بلکہ اس "شعبہ تبلیغ" میں مبلغین کی تیاری میں سارا زور اس پر صرف کیا جاتا ہے اور محض یہ امر ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ اپنے فقہی مسلک کے جواز کے کیا کیا نقلی و عقلی دلائل دیئے جا سکتے ہیں اور دوسرے مسالک کی رد میں کیا کیا براہین قاطع فراہم کئے جا سکتے ہیں۔ اس کج بحثی اور تفرقہ انگیزی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ایک حنفی کسی اہلحدیث امام کے پیچھے نماز پڑھنے کا روادار نہیں (الا ماشاء اللہ) چونکہ اس کے نزدیک اہل حدیث طریق پر نماز ہی ادا نہیں ہوتی گویا ایسے شخص کے خیال میں امام بخاریؒ جیسے جلیل القدر محدث ساری عمر غلط طریق پر نماز پڑھتے رہے اور ان کی کوئی نماز ہی ادا نہیں ہوئی یہی حال ایک اہلحدیث کا ہے الا ماشاء اللہ کہ وہ جماعت کے ثواب سے محرومی گوارا کرے گا، نماز با جماعت کے لئے حضورؐ کی سنت کو بخوشی ترک کر دے گا۔ اسی سنت کو جس پر ساری عمر حضورؐ کا عمل رہا ہے لیکن کسی حنفی امام کے پیچھے نماز ادا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا گویا اس

کے نزدیک امام اعظم ابو حنیفہ جیسے بزرگ نے اپنی تمام نمازیں ضائع کیں۔

فقہی اختلاف کے غلو اور ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرائی، محاذ آرائی اور رزم آرائی نے وحدت ملی، امت کے اتحاد، اور اس کی اجتماعیت کو پارا پارا کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے اور کر رہا ہے وہ کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس زمانہ میں اس طرز عمل کا ایک ردّ عمل یہ بھی ہو رہا ہے کہ ہماری نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جن کے اذہان و قلوب میں موجودہ مادہ پرستانہ تعلیم و تربیت اور تہذیب و تمدن، فلسفہ اور انکشافات جدیدہ نے پہلے ہی ماورا الطبیعیات عقائد (وجود باری تعالیٰ، رسالت، وحی، ملائک، کتب، حشر و نشر اور معاد) کے بارے میں شک و ریب کے کانٹے چبھو رکھے ہیں۔ مظاہر و رسوم عبادت (رفع یدین آمین بالجہر وغیرہ) کے فقہی اختلاف کے مسائل میں علماء کرام کے قولی جہاد کی شد و مد اور شدت و غلو نے دین سے بالکل ہی دور پھینک دیا ہے۔ اب ان کا دین سے نسلی تعلق بھی منقطع ہو رہا ہے اور وہ کھلم کھلا الحاد و زندقہ کے علمبردار بنتے چلے جا رہے ہیں۔

بالکل یہی منطقی نتائج دینی تحریکوں کے طریق کار کے اختلاف اور ان کی باہمی مخالفت و مخاصمت کے نکل رہے ہیں یہ نوجوان برملا پوچھتے ہیں کہ جب مقصد خدمت دین ہے، جب نصب العین اعلائے کلمۃ اللہ ہے، جب مقصود رضائے الٰہی ہے، جب مطلوب اقامت دین ہے تو ان جماعتوں کے درمیان طریق کار کا اختلاف کیوں؟ ہر ایک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کی بنا کیوں ڈال رہا ہے؟ اگر طریق کار، رائے اور تعبیر میں اختلاف ہے تو یہ اختلاف جائز حدود کے اندر کیوں نہیں رہتا؟ ان میں مشترکہ مقصد کے لئے اتحاد و اشتراک کیوں نہیں؟ اس کے برعکس ان میں افتراق، مخالفت، کشمکش اور تصادم کیوں ہے؟ یہ سوالات ہیں جو نئی نسل کے نوجوان کی طرف سے اٹھائے جاتے ہیں۔ اور اس کا شافی جواب کسی طرف سے نہیں ملتا چنانچہ اس طبقہ کے قلوب و اذہان میں ان مدعیان اصلاح اور خود نفس دین کے متعلق واہمے اور وسوسے پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ تجربات کی روشنی میں دنیا نے جنگ کے لئے بڑے بڑے اصول، ضابطے اور طریقے وضع کئے ہیں۔ جنگ میں ہر مورچہ پہ ضرورت کے مطابق پوری تیاری کی ضرورت ہوتی ہے، بے شمار محاذ کھولے جاتے ہیں جن کے لئے جاں نثار اور فدائی درکار ہوتے ہیں۔ یمین و یسار، قلب و ظہر غرضیکہ بہت سے محاذوں کے لئے فوج کی ضرورت ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں برّی، بحری، فضائی فوج کے علاوہ (FIFTH COLUMNISTS بھی ناگزیر ہوتے ہیں۔ فی زمانہ ٹھنڈی جنگ، پروپیگنڈا کی جنگ، ڈپلومیسی کی جنگ، اثر و رسوخ کی جنگ، فراہمی اسلحہ کی جنگ، اور نہ معلوم کس کس اور کون کون سے محاذوں اور مورچوں پہ جنگ لڑی جاتی ہے۔ ہر جنگ کا طریق کار بھی مختلف ہوتا ہے۔ اب اگر برّی فوج، ہوائی اور بحری فوج کے طریق کار کی افادیت سے انکاری ہو اور صرف اپنے ہی طریق کار کو "صحیح" سمجھے اور مدعی ہو کہ صحیح طور پر بس وہ ہی دشمن سے نبرد آزما ہے پھر یہی طرز فکر بحری اور فضائی فوج کا ہو تو کیا کوئی سلیم العقل انسان اس طرز فکر کو درست کہہ سکے گا!

اب اگر اسی پہ قیاس کر کے باطل کے خلاف رزم آرائی کا نقشہ بنے اور ہر محاذ کے لئے تیاری پیش نظر رکھی

جائے اور ہر مورچے پر استعداد و اہلیت اور رجحان طبع کے مطابق کارکن اور سپاہی تعینات ہوں اور ہر سپاہی کے سامنے اس جنگ کا مقصد و مطلوب واضح ہو کہ وہ یہ جنگ خالص رضاالٰہی کے حصول اور نجات اخروی کے لئے لڑ رہا ہے۔ دنیا کی کوئی چیز اس کا مطلوب و مقصود نہیں تو صورت حال یکسر بدل سکتی ہے اور باطل کے خلاف یہ جنگ دیکھتے ہی دیکھتے جیتی جا سکتی ہے جس کا بظاہر جیتنا امر محال نظر آتا ہے۔

آج ہر محاذ پر سپاہیوں کی ضرورت ہے، ایک مورچہ بھی نظر انداز ہو گیا تو بازی بالکل الٹ سکتی ہے، سیاسی میدان بھی ایک مورچہ ہے، بڑا اہم مورچہ ہے۔ سیاسی قوت کی ہمہ گیری سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کسی معاشرہ کے بناؤ اور بگاڑ میں اس قوت کا کتنا عمل دخل ہوتا ہے اسے ہر سمجھدار شخص اچھی طرح جانتا ہے۔ تعلیم گاہیں اور ابلاغ کے تمام جدید ذرائع و وسائل اس قوت کی تحویل میں ہوتے ہیں۔ تہذیب و ثقافت، معیشت و معاشرت کو اپنی پسند کے سانچے میں ڈھالنا اس کے اختیار میں ہوتا ہے۔ قانون سازی اور ان کی تنفیذ، عدل و انصاف کے لئے عدالتوں کا قیام اس کے ذمہ ہوتا ہے، امن و امان کے لئے پولیس اس کے کنٹرول میں ہوتی ہے۔ بیرونی جارحیت سے حفاظت کے لئے فوج اس کے ماتحت ہوتی ہے۔ خارجہ پالیسی اور باہر کی دنیا سے روابط استوار کرنا اور تعلقات منقطع کرنا اس قوت سے وابستہ ہوتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو، کوئی گوشہ اور کوئی شعبہ اس قوت قاہرہ سے آزاد نہیں ہے اور نہ رہ سکتا ہے۔ یہ ایک مورچہ ہے، بڑا اہم مورچہ ہے، بڑا کلیدی مورچہ ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس مورچہ کو خصوصی اہمیت ناگزیر ہے اس مورچہ پر بھی سپاہیوں کی ضرورت ناگزیر ہے۔

مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ اس طریق کار کے ذریعہ حقیقی کامیابی مشکوک ہے۔ محض الیکشن اور لفظوں، جلسہ اور جلوسوں اور احتجاجی مظاہروں سے نہ اسلامی معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے اور نہ ہی اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے تجدید ایمان کی جدوجہد اور عقائد و اعمال کی اصلاح کی سعی و کوشش اولیں شرط ہے لازمی و ناگزیر شرط ہے۔ میں اس کو بھی تسلیم کرتا ہوں کہ اگر کسی جذباتی رو میں بہہ کر جس کا امکان حد قیاس سے بھی ماورا ہے کبھی پارٹی یا ہاتھوں کی تبدیلی واقع ہو گئی یعنی جماعت اسلامی مسند اقتدار پر متمکن بھی ہو گئی تو اس تبدیلی سے اسلامی نظام نہیں آ سکتا۔ چونکہ اسلامی نظام اپنے نفاذ کے لئے پہلے اس معاشرہ کو وجود میں لانے کا تقاضا کرتا ہے جس میں مؤثر اوسط ایسے بندگان خدا کی ہو جن کے عقیدہ اور فکر و نظر کی اساس توحید خالص ہو اور جن میں عقیدہ کے مطابق عمل میں اصلاح نیز اخلاق اور کردار و سیرت کی تعمیر ہو چکی ہو اور جن کے دلوں میں عقیدہ و آخرت عین الیقین کی طرح راسخ ہو چکا ہو۔ اسلامی معاشرہ کے لئے ان شرائط کی تکمیل لازم ہے۔ ہمارا موجودہ معاشرہ جس کی نوے فیصد سے زائد آبادی کا تعلق اسلام سے محض نسبی اور نسبی ہو اور اس کے نزدیک چند خاص خاص مواقع پر چند "رسوم" کی ادائیگی کا نام ہی اسلام ہو پھر دس فیصد بقیہ آبادی کی اکثریت کا بھی اسلام سے تعلق افراط و تفریط پر مبنی ہو تو ایسے معاشرہ میں محض مسند اقتدار پر پہنچ کر اسلامی نظام کی کامیاب تنفیذ کا جو خواب دیکھا وہ جنت الحمقاء کا باسی ہی قرار دیا جا سکتا ہے دین اسلام ایک DOGMA کا نام نہیں ہے بلکہ سرتاپا عمل اور

کردار و سیرت کا نام ہے۔ اس میں "کامل فرمانبرداری" شرط لازم ہے۔ لہٰذا اس ملک میں جب تک تجدید ایمان اور شعوری ایمان کی کوششیں بارآور نہ ہوں، یہاں اسلامی نظام کا نفاذ محال اور اس کا چلنا ناممکن ہے۔ جب حقیقی و شعوری مسلمانوں کے فقدان کی وجہ سے نام نہاد اور نسلی مسلمانوں پر حضرت سیّد احمد شہید اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید جیسے پیکر صدق صفا کے ہاتھوں اسلامی نظام نہ چل سکا تو ہما شما کے ہاتھوں کیسے چل سکتا ہے۔ ان دونوں بزرگوں اور ان کے رفقا کے متعلق تاریخ یہ شہادت دیتی ہے کہ دور صحابہ رضؓ اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ کے بعد ایسے نفوس قدسیہ کی بحیثیت 'جماعت' کوئی نظیر نہیں ملتی۔

میں اس امر سے بھی واقف ہوں کہ قیام پاکستان سے قبل بالکل یہی موقف جماعت اسلامی کا تھا اس کی دعوت کی اساس بندگی رب کی آفاقی دعوت تھی، قومی مسائل سے وہ بے تعلق تھی بلکہ محض "قوم" کی بنیاد پر اُس وقت کی اہم تحریک کے ساتھ اس کا معاملہ ترک موالات بلکہ تنقید اور وہ بھی تند و تیز تنقید کا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد جماعت کی آفاقی دعوت رفتہ رفتہ قومی دعوت بنتی چلی گئی گو اس نے اس تبدیلی اور انحراف کا نہ پہلے اعتراف کیا اور نہ اب اس کی معترف ہے جبکہ اب اس کی تک و دو اور طریق کار تقسیم ملک سے قبل کی "مسلم لیگ" کے بالکل قریب آچکا ہے بلکہ اس کا چربہ ہے اگرچہ بڑا ناقص ہے میں جماعت کے کارکنان کے اس دینی انحطاط اور زوال سے بھی واقف ہوں جو سیاسی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے اور لوگوں کے ووٹ حاصل کرنے کے شوق میں رونما ہو رہا ہے۔ میں اس المیہ کا بھی علم رکھتا ہوں جو ۱۹۵۷ء میں ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں اور ما قبل و مابعد رونما ہوا۔ میں ان زیادتیوں کا بھی ذاتی علم رکھتا ہوں جو جماعت کے صف اوّل کے ان اکابر کے ساتھ روا رکھی گئیں جو جماعت کو تقسیم سے قبل کے موقف پر رجوع کرنے کی دعوت کے علمبردار تھے۔ جن کے نزدیک عملی سیاست میں حصّہ لینے سے قبل معاشرہ میں عقیدہ و عمل کی اصلاح کی ہمہ گیر تحریک چلانے اور اس کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی ضرورت ناگزیر تھی جو اس بات کے متمنی تھے کہ کارکنوں کو سیاسی کاموں میں لگانے کے بجائے ابھی دعوتی کاموں میں کھپا دینا چاہیئے چونکہ اول الذکر کام میں بگاڑ کا غالب اندیشہ ہے اور موخرالذکر ان کی تربیت و اصلاح کا مؤثر ذریعہ ہے۔ میں اس ٹریجڈی سے بھی واقف ہوں کہ جماعت نے ۵۸/۱۹۵۷ء کے متوقع الیکشن میں حصّہ لینے کے شوق اور قابل ذکر کامیابی کے حصول کی توقع کے زعم میں جماعت کے صف اوّل کے ان تمام اکابر کی جماعت سے علیحدگی بخوشی گوارا کر لی جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے مقام پر ایک جماعت اور ادارہ کی حیثیت رکھتا تھا جن میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے بانی جماعت کے زمانہ اسارت میں امارت کے فرائض بڑی خوش اسلوبی اور احسن طریق پر انجام دیئے تھے[۱]، ان میں وہ بزرگ بھی شامل تھے جن کی جوانی کی توانائیاں اور جن کا خون پسینہ جماعت کی بنیادوں میں رچا بسا تھا وہ لوگ بھی شامل تھے جن کے علم دین، علم دنیا اور جن کی اصابت رائے اور جن کے تقویٰ کے جماعت والے ہی نہیں، جماعت کے باہر والے، حتیٰ کہ مخالفین تک مقر اور معترف تھے جن کی جگہ پر کرنے والے جماعت میں دور و نزدیک نظر نہیں آتے تھے اور نہ اب تک نظر آتے ہیں (یہ دوسری بات ہے کہ اوّل تو ۱۹۵۸ء

[۱] جیسے مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالجبار غازی، مولانا عبدالغفار حسن اور شیخ سلطان احمد۔

کے مارشل لا نے ساری تمناؤں کا خون کر دیا اور پھر جب تقریباً بارہ سال کے بعد الیکشن میں پورے زور شور اور اہتمام کے ساتھ حصہ لیا گیا تو کامیابی کے تمام خواب چکنا چور ہو گئے اور نتیجہ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" کی صورت میں برآمد ہوا۔

بر ایں ہمہ میرا موقف یہ ہے کہ جماعت کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ آپ کی کسی تنقید کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلے گا۔ جماعت جس مقام پر پہنچ چکی ہے اس سے مراجعت ممکن ہی نہیں پھر بہر حال وہ ایک اہم محاذ پر لگی ہوئی ہے جس کا ایک مثبت پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ وہ بگاڑ کے عمل کو روکنے میں اگرچہ ناکام ہے، لیکن بہر نوع وہ ایک CHECK اور بریک کا کام ضرور کر رہی ہے فی الوقت جس طرز فکر کا ایوان سیاست میں غلبہ اور زبردست غلبہ ہے اس کے عزائم کی تکمیل میں جماعت حارج ہے اور جماعت کے اثر سے یہ طبقہ خائف بھی ہے۔ مسلم لیگ کی خالص قومی تحریک کا بھی آخر یہ خیر کا پہلو نکل چکا ہے کہ پاکستان کے نام سے مسلمانوں کی ایک آزاد مملکت وجود میں آئی، اس لئے جماعت کے کاموں میں خیر کا کوئی پہلو نہ سمجھنا غیر انصاف ہے۔

آپ کے اوقات کا مصرف اب یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ماضی گوٹ کے بعد کے حالات کے بیان اور جماعت پر تنقید کے لئے آپ قلم سنبھالیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس طریق کار پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے اور جو طریق اقرب الی الصواب ہے جس کی صلاحیت بھی آپ کو ودیعت فرمائی ہے۔ آپ اسی کام میں لگے رہیئے۔ تجدید ایمان کی دعوت کی علمبرداری کی سعادت جماعت اسلامی کو ملی تھی اس نے اس نعمت کی قدر نہیں کی۔ وہ اس دشوار گزار گھاٹی کو عبور نہ کر سکی۔ حب عاجلہ نے اس کو وقت سے پہلے، بہت پہلے اس میدان میں لا کھڑا کیا جس نے سالوں کی تربیت کو دنوں میں خاک میں ملا دیا آپ خدارا اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہیئے اور دعا کیجئے کہ وہ حب عاجلہ سے آپ کو محفوظ رکھے۔ اسی طرح آپ تلاوت آیات، تزکیہ نفس اور تعلیم و کتاب و حکمت کے کام میں لگے رہیئے۔ یہی صحیح ترین راستہ ہے، یہی اقرب الی منہاج النبوت ہے اسی میں آخرت کی سرخروئی ہے۔ اسی ذریعہ سے معاشرہ میں تجدید ایمان کی تحریک پھلے گی، پھولے گی انشاء اللہ۔ آپ کی ان مخلصانہ کوششوں اور دوسری دینی تحریکوں کی سعی و جہد میں جس حد تک اشتراک و تعاون ہو سکے اس پر لبیک کہیے۔ اگر بدقسمتی سے اشتراک و تعاون کی راہ پیدا نہ ہو تو بہر حال تصادم اور مخالفت و مخاصمت سے اپنا دامن بچایئے اسی میں عافیت ہے اور اسی میں خیر ہے۔

مثبت طریق پر اپنے طریق کار کی افادیت کو ثابت کرنے کا میں کسی درجہ میں بھی مخالف نہیں بلکہ میں اس کی شدید ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ ماہنامہ میثاق میں آپ کی قلم سے یا کسی دوسرے صاحب علم کی قلم سے ایک سلسلہ مضامین شروع ہونا چاہیئے جس کے ذریعہ مثبت طریق پر اس طریق کار کی برتری اور افادیت کو استدلال سے قارئین کے سامنے پیش کیا جاتا رہے جو آپ نے اختیار کیا ہے۔ اگر موجودہ تحریکوں سے طریق کار سے تعرض ناگزیر ہو اور ان پر نقد ضروری ہو تو مثبت انداز میں استدلال اور دل سوزی کے ساتھ بات کہنی اسلامی تعلیمات کا بھی تقاضا ہے اور یہی اسلوب انشاء اللہ مؤثر بھی ہو گا۔ آخر میں دست بدعا ہوں اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ، آمین یا رب العلمین!!

فہرست مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ افغانی روڈ ۔ سمن آباد ۔ لاہور (فون : ۶۸۲۳۵)

تصنیف امام حمید الدین فراہی رحمہ

ہدیہ ۲۳/-

★ مجموعہ تفاسیر فراہی رحمہ

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

★ سلسلۂ تدبر قرآن : — ہدیہ ۶/-
● مبادیٔ تدبر قرآن : تدبر قرآن کے اصول و قواعد پر اہم دستاویز — ہدیہ ۲/-
● مقدمہ تدبر قرآن و تفاسیر آیت بسم اللہ و سورۂ فاتحہ
● مقدمہ تدبر قرآن و تفسیر از ابتدا تا سورۂ آل عمران — ہدیہ ۳۰/-
● تدبر قرآن جلد اول مشتمل بر مقدمہ و تفسیر از ابتدا تا سورۂ آل عمران — ۳۲/-
● تدبر قرآن جلد دوم مشتمل بر تفصیل سورۂ نساء تا سورۂ اعراف — ۳۰/-
● تدبر قرآن جلد سوم مشتمل بر تفسیر سورۂ انفال تا سورۂ بنی اسرائیل
★ حقیقت دین : مشتمل بر حقیقت شرک ، حقیقت توحید ، حقیقت تقویٰ اور حقیقت نماز — ۱۲/-
۵/-
★ دعوت دین اور اس کا طریق کار — ۰/۵۰
★ اقامت دین کے لئے انبیاء کرام کا طریق کار — ۰/۹۰
★ قرآن اور پردہ

تصانیف ڈاکٹر اسرار احمد

۳/-
★ تحریک جماعت اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ — ۰/۵۰
★ اسلام کی نشاۃ ثانیہ : کرنے کا اصل کام — ۱/-
★ مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق — ۱/۵۰
★ WHAT DO THE MUSLIMS OWE TO THE QURAN — ادنیٰ ۰/۳۰ — اعلیٰ ۱/۰
★ راہ نجات : سورۂ والعصر کی روشنی میں — ۰/۵۰
★ قرآن اور امن عالم — ۰/۷۵
★ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

تالیف ڈاکٹر محمد رفیع الدین

★ اسلامی تحقیق کا مفہوم ، مدعا اور طریق کار — اعلیٰ ۱/۵۰ — ادنیٰ ۱/۰

——— (محصول ڈاک ان قیمتوں کے علاوہ !) ———

اور

★ ماہانہ **میثاق** لاہور — چندہ سالانہ ۱۰/- فی پرچہ ۱/۰

دینی ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے ایک سنہری موقع

اور خصوصاً سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کے لئے

تعطیلات گرما کا بہترین مصرف

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے زیر اہتمام

دینی تعلیم و تربیت کا ایک ماہی پروگرام

از یکم تا ۳۱ جولائی ۱۹۷۴ء

★ روزانہ بعد نماز مغرب، درس قرآن حکیم — از ڈاکٹر اسرار احمد، جس میں وہ مطالعۂ قرآن حکیم کے اپنے مشہور 'منتخب نصاب' کا سلسلہ وار درس دیں گے۔

★ روزانہ بعد نماز فجر، درس حدیث جس میں انشاء اللہ مشکوٰۃ شریف کے پہلے دو اجزاء یعنی کتاب الایمان اور کتاب العلم مکمل پڑھائے جائیں گے۔

★ روزانہ بعد نماز عصر، قواعد لغت عربی کا ایک سبق جس میں انشاءاللہ ایک ماہ میں ابتدائی قواعد کی تکمیل مع مشق کرادی جائے گی۔

— — علاوہ ازیں — —

صبح ۸ تا ۱۲ بجے باقاعدہ کلاسز کی صورت میں مطالعہ کتب، مذاکرہ باہمی مشق تقریر و خطاب اور تصحیح قراءت و تجوید

— — — اور سب سے بڑھ کر — — —

شب و روز کا ایک دینی معمول اور پاکیزہ ماحول

قیام و طعام کا انتظام اجتماعی ہوگا۔ ایک ماہ کے طعام کے اخراجات یک صد روپے، شرکت کے خواہشمند حضرات زیادہ سے زیادہ ۲۵ جون تک مطلع فرماویں اور رقم ارسال کر دیں۔ جو حضرات اخراجات طعام ادا کرنے سے قاصر ہوں وہ زیادہ سے زیادہ بیس جون تک اپنی خواہش شرکت سے مطلع فرما دیں تاکہ ۲۵ جون تک انہیں واپسی اطلاع پہنچ سکے۔

المعلن: ناظم اعلیٰ، مرکزی انجمن خدام القرآن، ۱۲۔ افغانی روڈ، سمن آباد، لاہور

(فون ۶۸۲۴۵)

پبلشر: محی الدین، طابع: شیخ محمد اشرف مالک اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور
مقام اشاعت: کوثر روڈ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور